مجید لاہوری کی

حرف و حکایت

مرتب: شفیع عقیل

میری لائبریری

میری لائبریری

187

۸/-

مجید لاہوری

کے

حرف و حکایت

میری لائبریری

(۱۸۷)

میری لائبریری کی دل خوش کن کتب

حماقتیں	شفیق الرحمٰن
مزید حماقتیں	″
لہریں	″
پرواز	″
دغاباز	مترجم کمال احمد رضوی
لفنگے کی ڈائری	″
شیشہ و تیشہ	کنہیالال کپور
سنگ و خشت	″
چنگ و رباب	″
نوک نشتر	″
بال و پر	″
نرم گرم	″
گرد کارواں	″
دلیل سحر (نیا مجموعہ)	″
تل پھل (پنجابی)	″
اندیشہ شہر	احمد جمال پاشا
راجہ صاحب	شوکت تھانوی
گرما گرم (لطیفے)	اشفاق احمد
محفل معمہ گوئی (مصور)	منظور الحق صدیقی
دودھ کے دھلے	وجاہت علی سندیلوی
رنگا رنگ (لطیفے)	مرتبہ شہناز بشیر
پڑھو اور ہنسو	میاں محمد ابوالفتح
شہرت کی خاطر	نذیر صدیقی

مجید لاہوری

کی

حرف و حکایت

مُرتّب

شفیع عقیل

مکتبہ میری لائبریری - لاہور ۲

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No 037644
MAILSI

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

میری لائبریری ہی میں پہلی بار ۱۹۷۱ء

ناشر :- بشیر احمد چودھری
ڈائرکٹر مکتبہ میری لائبریری لاہور ۲

طابع :- مکتبہ جدید پریس لاہور

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

"مجیدؔ لاہوری
کے دوست اور قدردان
جناب میر خلیل الرحمٰن
کے نام"

مجید ایک نظر میں

خاندانی نام	عبدالمجید چوہان
ادبی نام	مجید لاہوری
قلمی نام	نمک لاہوری
سنہ پیدائش	سنہ ۱۹۱۳ء
جائے پیدائش	گجرات (پنجاب)
پہلی شادی	سنہ ۱۹۴۳ء
دوسری شادی	سنہ ۱۹۵۶ء
تاریخ وفات	۲۶۔ جون سنہ ۱۹۵۷ء، کراچی

ترتیب

پہلی بات

مجید لاہوری کو ہم سے جدا ہوئے چودہ برس بیت چکے ہیں۔ بظاہر چودہ برس کا عرصہ خاصا طویل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس قدر طویل بھی تو نہیں ہے کہ ہم ایک فن کار کو بالکل ہی بھول جائیں اور پھر فن کار بھی ایسا جو اپنے انداز فکر اور طرز بیان میں سب سے الگ ہو۔ جس کا انداز تحریر اپنانے کے باوجود کسی سے اپنایا نہ جا سکے۔ میری ذاتی رائے میں تو مجید لاہوری کی یہی انفرادیت انہیں اردو ادب میں زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے اپنی اسی خوبی کی وجہ سے وہ آج بھی انگنت ذہنوں میں محفوظ ہیں اور ان کا نام لیتے ہی ماضی کے جہت سے ورق الٹ جاتے ہیں۔

قارئین کے لئے یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہو گی کہ ۲۶ جون ۱۹۵۷ء میں جب مجید لاہوری کا انتقال ہوا تو کراچی کے تین حضرات نے دعویٰ کیا کہ مجید لاہوری کا کالم، ہم

لکھتے تھے، وہ نہیں لکھتے تھے۔ لہٰذا ان کی جگہ انہیں کالم نویس کی حیثیت سے ملازم رکھ لیا جائے۔ ان میں سے ایک تو خاتون تھیں جو ذہنی عدم توازن کا شکار تھیں۔ دوسرے صاحب ایک کالج میں پڑھاتے تھے۔ (غالباً اب بھی پڑھاتے ہیں) اور تیسرے صاحب اب ایک اخبار میں ملازم ہیں۔ تعجب اس بات کا ہے کہ یہ صاحب خود کالم لکھتے ہیں لیکن ان بیس برس کے عرصے میں وہ ایک کالم بھی ایسا نہ لکھ سکے جو مجید لاہوری کا رنگ ڈھنگ لیے ہوتا اور جس سے ان کے دعوے کا کچھ ثبوت ملتا۔ میں تو اسے بھی مجید کی انفرادیت ہی سمجھوں گا کہ ان کا انداز بیان اور طرز تحریر ان کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ اور کوشش کے باوجود اسے کوئی اپنا نہ سکا۔

مجید لاہوری شاعر تھے، ادیب تھے اور صحافی تھے۔ انہوں نے نظم نگاری بھی کی غزل گوئی میں بھی پیچھے نہیں رہے، قطعہ نگار بھی رہے، مضمون نویس بھی تھے، طنز کے تیر بھی چلائے مزاح کے پھول بھی کھلائے اور سنجیدہ موضوعات پر بھی قلم اٹھایا۔ اس طرح انہوں نے کئی ایک اصناف ادب میں اپنی خداداد صلاحیت کا اظہار کیا اور فنکاری اور پرکاری سے کیا۔ لیکن میرے خیال میں جس صنف میں وہ زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں وہ ان کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری اور فکاہیہ نویسی یا کالم نگاری ہے۔ خاص طور پر کالم نگاری میں ان کی شخصیت زیادہ متعین اور نکھری ہوئی دکھتی ہے ہو سکتا ہے اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ صحافت ان کا پیشہ بھی تھا اس لیے انہیں شہرت اور مقبولیت بھی اسی سے حاصل ہوئی۔ وہ کئی برس تک "روزنامہ جنگ" کراچی میں "حرف و حکایت"، کے عنوان سے مزاحیہ کالم لکھتے رہے جو خاص و عام میں یکساں مقبول اور دل و دماغ میں اتر جانے والی چیز تھی۔ کچھ عرصہ کے لیے انہوں نے اپنے

کالم کا نام "رنگ و نیرنگ" بھی رکھ لیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ روزنامہ "امروز" کراچی میں مولانا چراغ حسن حسرت کا مزاحیہ کالم بھی اسی عنوان سے چھپنے لگا تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنے کالم کا عنوان "رنگ و نیرنگ" رکھ لیا لیکن یہ تبدیلی زیادہ دنوں تک نہ چل سکی اور وہ دوبارہ "حرف و حکایت" ہی کے عنوان تلے لکھنے لگے۔ اور پھر آخر دم تک وہ اسی عنوان سے روزانہ کالم لکھتے رہے۔ یہ مختصر کتاب ان کے انہی کالموں کے انتخاب پر مشتمل ہے۔

ہماری صحافت میں فکاہیہ نویسی یا کالم نگاری کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اخباروں میں یہ روایت ماضی میں دور تک نہیں جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس ضمن میں چند ایک نام ہی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جن میں دو نام بڑے نمایاں ہیں۔ مولانا عبدالمجید سالک کا "افکار و حوادث" اور مولانا چراغ حسن حسرت کا "مطائبات" اور "حرف و حکایت"۔ ایک زمانے میں حاجی لق لق کے "فکاہات" کا شہرہ تھا لیکن اب وہ داستان پارینہ کے سوا کچھ نہیں۔ مجید لاہوری کے انتقال کے بعد شوکت تھانوی آئے۔ انہوں نے پہلے "وغیرہ وغیرہ" اور اس کے بعد "پہاڑ تلے" لکھنا شروع کیا۔ موجودہ لکھنے والوں میں احمد ندیم قاسمی، ابن انشاء، ابراہیم جلیس، انتظار حسین نصراللہ خاں، انعام درانی، منو بھائی، نذیر ناجی اور دو ایک دوسرے نام شامل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں ابن انشاء سب سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مجید لاہوری آج بھی فکاہیہ نگاروں کی فہرست میں منفرد اور تنہا نظر آتے ہیں۔ ان کا رنگ سب سے جدا، ان کا انداز سب سے نرالا، اور ان کا بات کہنے کا ڈھنگ انوکھا ہے۔ یہ بات پوری دیانتداری اور وثوق

سے کہی جا سکتی ہے۔ کہ اس وقت بھی اُردو صحافت میں مزاحیہ کالم نگاری کے سلسلے میں مجید لاہوری کا نام سرفہرست دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو شہرت اور مقبولیت مجید کو حاصل ہوئی وہ اور کسی کالم نگار کو حاصل نہ ہو سکی۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ مجید نے اپنے کالم میں نہ تو محض ادبی روایات کا سہارا لیا، نہ محض لفاظی اور رعایت لفظی کے چکر میں پڑے اور نہ صرف زبان دانی کا مظاہرہ کر کے قاری کو مرعوب کیا۔ بلکہ انہوں نے جہاں یہ کیا کہ عوام کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔ وہاں عوام کی زبان بھی استعمال کی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنا وہ منفرد انداز تحریر بھی پیدا کیا جو عوام کے ذہنوں کے قریب اور دلوں کے نزدیک ہو سکتا تھا۔ وہ قاری کو بے مقصد ہنسانے کے قائل نہیں تھے۔ چٹکیاں بھی لیتے تھے۔ طنز کے تیر بھی چھوڑتے تھے، اور پھر ہنسانے کے بعد سوچنے سمجھنے پر بھی مجبور کرتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ کہ مجید لاہوری اردو صحافت میں پہلے کالم نویس تھے۔ انہوں نے اپنے کالم کو محض سیاسی و ادبی چٹکلوں اور لطیفوں سے الگ رکھ کر براہ راست عوام سے ناتا جوڑا۔ ان کا کالم عوامی کالم تھا اور انہوں نے اس میں عوام ہی کی ترجمانی کی۔ وہ بات کہنا جانتے تھے۔ اور بات کہتے تھے اور یہ ان کے فن کی سب سے بڑی خوبی تھی۔

مجید لاہوری نے چند مخصوص کردار بھی تخلیق کئے تھے جن کی زبان اور انداز میں وہ سیاسی، معاشی، تہذیبی، معاشرتی اور اخلاقی مسائل پیش کرتے تھے۔ ان کے یہ کردار ہر طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ یعنی انہوں نے ہر طبقے کے لیے ایک کردار تخلیق کر لیا تھا۔ جو اس مخصوص طبقے یا شعبۂ زندگی کی نمائندگی کرتا تھا

ان کے ان کرداروں میں رمضانی، سائیں سلیمان بادشاہ، مولوی گلشیر خان، سیٹھ ٹیوب جی ٹائر جی، بندو خان، چمن شاہ برساتی، تجوری بھائی بینک بیلنس جی اور شیخ حمار اللہ شامل ہیں۔ ان میں سے رمضانی نے ہمہ گیر شہرت اور مقبولیت حاصل کی اور آج تک لوگ اسے استعمال کرتے ہیں۔ ان کرداروں کی زبان سے بات تو وہ وہی کہلواتے تھے جو انہیں خود کہنا ہوتی تھی۔ لیکن زبان اور انداز کردار کا استعمال کرتے تھے۔ تاکہ پڑھنے والا مفہوم و مطالب کے زیادہ سے زیادہ قریب ہو جائے۔ اردو صحافت میں فکاہیہ نویسی میں کرداروں کی تخلیق کے سلسلے میں بھی وہ منفرد اور دوسروں سے الگ نظر آتے ہیں۔

مجید لاہوری کی وفات کے ایک برس بعد جب میں نے "مجید لاہوری" کے نام سے ان پر ایک مبسوط کتاب لکھی تھی، اس وقت سے ہی میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ ان کے کالموں کا انتخاب کرنا چاہئے۔ پھر یہ بھی تھا کہ مولانا عبدالمجید سالک نے جو مجید لاہوری کے استاد بھی تھے ان کی موت پر میرے نام ایک اپیل کی تھی جو ۲۸ جون ۱۹۵۷ء کے اخبارات میں چھپی تھی۔ اپنی اس اپیل میں انہوں نے کہا۔

مجید لاہوری نے بلاشبہ مزاحیہ نظم و نثر میں بڑا نام پیدا کیا لیکن ان کی متین شاعری بھی بے حد قابلِ قدر ہے۔ انہیں ادبی نثر نویسی کا دعویٰ نہ تھا لیکن زبان ہمیشہ صحیح لکھتے تھے اور "حرف و حکایت" کا انداز اس قدر سادہ، سلیس اور دلکش تھا کہ خواص و عوام چٹخارے لے لے کر پڑھتے تھے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کا متین کلام، ان کا مزاحیہ کلام اور ان کی نثر کے بعض اقتباسات کتابی صورت میں مرتب ہو جائیں۔ انہوں نے بلا مبالغہ ہزاروں نظمیں اور غزلیں لکھی ہیں جو اخباروں اور رسالوں میں بکھری ہوئی ہیں۔ میں عزیزی شفیع عقیل سے گذارش

کروں گا، کہ وہ ان کی فراہمی کا کام اپنے ذمے لیں کیوں کہ وہ "نمکدان" میں مجید کے ساتھ کام بھی کرتے رہے ہیں اور انہیں مجید کی افتادِ طبع اور ان کے حالات سے پوری واقفیت ہے"

مولانا عبدالمجید سالک مرحوم، کی اس اپیل نے بھی مجھے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ مجھے مجید کے کالموں کا انتخاب کرنا ہی چاہیئے۔ یوں تو اگر مجید لاہوری کے کالموں کا مکمل انتخاب کیا جائے تو شاید کئی جلدوں کی ضرورت پیش آئے۔ کیونکہ انھوں نے بہت زیادہ لکھا ہے اور ان کے بے شمار کالموں میں اچھے اور ہمیشہ رہنے والے کالموں کی کمی نہیں ہے لیکن مکمل انتخاب کے لیے وقت کی ضرورت تھی۔ اور آپ جانتے ہیں آج کے ہماہمی کے دور میں وقت اور فرصت ذرا مشکل ہی سے ملتے ہیں۔ اسی لیے یہ معاملہ کئی برس سے ٹلتا چلا آرہا تھا۔ اب میں نے سوچا، اور کچھ نہیں تو ان کے اتنے کالم تو مرتب کر ہی دیئے جائیں جن سے لوگ مجید کو یاد رکھ سکیں اور نئے پڑھنے والے ان کے اندازِ تحریر سے واقف ہو سکیں۔

اس کتاب میں شامل تمام کالم جون ۱۹۵۷ء سے پہلے کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں اور میں نے ہر کالم کے آخر میں اخبار کی وہ تاریخ بھی دیدی ہے جس تاریخ کو یہ شائع ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ میں نے کالم کا انتخاب کرتے وقت اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا ہے کہ اس مجموعے میں ان کا ہر موضوع، ہر طرز، اور ہر انداز کا کالم شامل ہو جائے۔ تاکہ پڑھنے والوں کو ان کے اندازِ فکر اور اندازِ تحریر کا صحیح اندازہ ہو سکے البتہ ترتیب میں وقت اور زمانے کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجید نے جن موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ اور جو مسائل لیے ہیں وہ بذاتِ خود وقت اور زمانے کی قید میں نہیں آتے۔ ان میں سے بیشتر مسائل آج بھی جوں کے توں موجود

ہیں اور وہی موضوعات ہیں جن پر آج لکھا جارہا ہے مقصد تو صرف یہ ہے کہ پڑھنے والا یہ جان سکے کہ مجیدؔ نے ان مسائل کے بارے میں کیونکر سوچا اور کس طرح اظہار خیال کیا۔ بس یہی ایک چیز میرے پیش نظر رہی ہے۔

اس کتاب کے سلسلے میں مجھے اخلاقی طور پر روزنامہ "جنگ" کراچی اور پنڈی کے مالک جناب میر خلیل الرحمان کا ضرور شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ اس انتخاب کا انتساب بھی انہی کے نام کیا ہے۔ کیونکہ مجیدؔ ان کے ملازم کم اور دوست زیادہ تھے۔ اس طرح قدیم رفاقت کی ایک یاد تازہ رہے گی۔

شفیع عقیلؔ

۷۱ — ۹ — ۲۹

کراچی

"میرا کالم"!

آج میں اپنے کالم ــــ "حرف و حکایت" کے متعلق آپ سے کچھ باتیں کرتا ہوں!۔

میرا کالم ــ! ایک بھوکا بچّہ ہے جو ہر صبح منہ پھاڑ کر میرے سامنے کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے۔ "چچا جان۔ بھوک لگی ہے۔!" ــــ میں کہتا ہوں ــــ ابھی نہ دودھ والا آیا ہے، نہ ڈبل روٹی والا۔ دیکھو اور انتظار کرو۔ اگر وہ کچھ دیر صبر سے کام لیتا ہے تو میں نہایت اچھی غذا سے اس کا پیٹ بھرتا ہوں اور جب چیخ دھاڑ سے آسمان سر پر اٹھا لیتا ہے تو میں اسے ــــــ "باسی دال بھات" بھی دے دیتا ہوں۔ لیکن ایسا بہت کم

ہوتا ہے۔ مگر یہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ رات کا کھانا کھائے بغیر سو گیا ہو۔

سب جانتے ہیں کہ دفتری نظام میں ہم "مسل" کا پیٹ بھرتے ہیں اور "مسل" ہمارا پیٹ بھرتی ہے۔ لہذا میں بھی ہر روز "مسل" کا پیٹ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے بھرتا ہوں۔ میں لکھتا ہوں اور لکھتا چلا جاتا ہوں۔ ایک دوست نے کہا یوں لکھتے لکھتے تمام موضوع ختم ہو جائیں گے۔ پھر تم کس پر لکھوگے؟ میں نے کہا میرے بھائی! میرا موضوع زندگی ہے۔ میرے اردگرد اتنی چیزیں ہیں جو کہتی ہیں مجھے بھی لکھ لو۔ مگر میں کہتا ہوں۔ تمہاری باری بھی آئے گی۔ تم کو بھی کالم "الاٹ" کروں گا۔ مگر اطمینان سے "کیو" میں کھڑی رہو بہت سی چیزیں ایک دوسرے کو دھکیلتی ہوئی بالکل اس طرح جیسے لوگ بس میں سوار ہوتے ہیں میری طرف بڑھتی ہیں اور میرے دماغ پر سوار ہو جاتی ہیں۔ کبھی تو میں انہیں معاف کر دیتا ہوں اور کبھی بس کے "کنڈیکٹر" کی طرح انہیں ذہن سے اتار دیتا ہوں۔

میں نے اپنے دوست سے کہا زندگی اتنا وسیع موضوع ہے جو زندگی بھر ختم نہیں ہوتا۔

"ٹرائی کرو مہربان اندر سے لال نکلے گا۔" لے جاؤ۔ ٹھنڈا اور میٹھا تربوز!"

بولٹن مارکیٹ پر ٹھیلے والے کی یہ صدا سُن کر میں سوچنے لگا کہ کیا ایسے تربوز بھی ہوتے ہیں جو اوپر سے بھی سبز ہوں اور اندر سے بھی ؟

چنانچہ میں نے اس سے کہا !۔

بھائی ایسا تربوز دو جو اوپر سے بھی سبز ہو۔ اور اندر سے بھی ——— وہ میرا منہ تکنے لگا !۔

میں اس کا مضحکہ اڑا رہا تھا۔ سب جانتے ہیں کہ تربوز اندر سے لال ہوتا ہے ، بھلا کہنے کی کیا ضرورت ہے اور وہ مجھے بمبئی والوں کی زبان میں "مستک فریلا" یعنی احمق سمجھ رہا تھا۔

خیر یہ سمجھ کر کہ تربوز اندر سے بہت ہی سرخ ہوگا اور اس وجہ سے میٹھا بھی ہوگا ۔ اس لئے وہ صدا لگا رہا ہے۔

"اندر سے لال نکلے گا ۔"

مگر یہ دوسرا ٹھیلے والا کہہ رہا ہے !۔

"ہری اور ملائم ہیں ۔"

"ہری اور ملائم ہیں ——— دو آنہ پاؤ !"

ہم تو دو آنکھوں پر دو اور آنکھیں جنہیں عینک کہتے ہیں لگا کر دیکھ رہے ہیں کہ ککڑیاں ہری ہیں ۔ ہم کیا ایک اندھا ہمیں بتا سکتا ہے کہ ککڑیاں ہری ہیں ممکن ہے کسی ملک میں کالی یا لال بھی ہوں مگر ہم نے تو جہاں بھی ککڑیاں دیکھیں

ہری ہی دیکھیں اور ملائم کے سلسلہ میں کہنے کی اس لئے ضرورت نہیں کہ وہ نظر ہی آ رہی ہیں۔

ہاں تو چلتے وقت میری آنکھیں دیکھتی ہیں اور میرے کان سنتے ہیں میرا دماغ ان سب کو محفوظ کر لیتا ہے اور میرا قلم کاغذ پر ان کو اُگل دیتا ہے۔ جو کچھ میں لیتا ہوں وہی لوٹا دیتا ہوں۔

جلسے ــــ پارٹیاں ــــ تقریریں ــــ زندہ باد ــــ مردہ باد واپس جاؤ ــــ اللہ اکبر ــــ سینما ــــ ہوٹل ــــ پارک ــــ کلب ــــ فٹ پاتھ ــــ جھونپڑیاں ــــ بنگلے ــــ چانڈو خانے ــــ!

غرضیکہ جدھر جدھر جاتا ہوں۔ مجھے کچھ نہ کچھ ملتا ہے کچھ زمانے کی حماقتیں ــــ کچھ اپنی ــــ اور کبھی کبھی میں ان دونوں کو اس طرح ملا دیتا ہوں جیسے گھی میں تیل یا دودھ میں پانی ــــ!

اب تک جو میں عرض کر چکا ہوں۔ وہ میرے کالم کا ایک رنگ ہے۔ یعنی ذہنی تخلیق ــــ میرا ذہن جو کچھ سوچتا ہے وہی میں لکھتا ہوں یا سنتا ہوں اس کو بالکل سچی تصویر بناتا ہوں مثلاً ایک فقیر کو بھیک مانگتے پاتا ہوں یا یہ گاتے ہوئے سنتا ہوں ؎

"نیک مائی نیک بابا۔ دے خدا کی راہ میں"

اگر میں خالص ادب بگھارنے پر آجاؤں تو یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ فقیر فٹ پاتھ پر گا رہا تھا ؎

"تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا"

اخبار سب پڑھتے ہیں۔ آپ بھی اور میں بھی لیکن آپ صرف "باخبر" ہونے کے لئے پڑھتے ہیں اور میں "خبردار" ہونے کے لئے۔ بہت سی چیزیں مجھے اخباروں میں ملتی ہیں۔ ——ان پر بھی میں لکھتا ہوں ——لیڈروں کے بیان—— سماج کی برائیاں——جلسوں کی خبریں——قراردادیں—— دلچسپ واقعات——غرضیکہ چیونٹی سے ہاتھی اور گدھے سے ہوائی جہاز تک میری دنیا ہے۔

میرے کالم میں سیاست بھی ہے——ادب بھی ہے—— تنقید بھی ہے——لیکن تحقیق نہیں ہے——کسی سے بگڑوں تو اسے شیطان نہیں کہتا——اور کسی سے خوش ہوں تو اسے فرشتہ نہیں سمجھتا۔ آدمی کو ہر حال میں آدمی سمجھتا ہوں یہ اور بات ہے کہ ؎

آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

بعض معاملات کے متعلق میری حتمی رائے ہوتی ہے اور بعض کے متعلق قطعی کوئی رائے نہیں ہوتی۔ پہلی صورت میں تو کھل کر جو کچھ اپنی دانست میں درست سمجھتا ہوں لکھتا ہوں اور

"مجید لاہوری کی حرف و حکایت"

دوسری صورت میں ——— "ایڈیٹر کا نامہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں" قسم کا انداز اختیار کرتا ہوں۔ اس مرحلے پر مختلف کردار اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

رمضانی

بندو

گلشیر خاں

ٹیوب جی ٹائر جی

بنک بیلنس بھائی

سائیں سلیمان بادشاہ

ان کرداروں میں رمضانی عوام کے ذہن سے سوچتا ہے اور ان کی زبان میں بولتا ہے بندو متوسط درجہ کے لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ گلشیر خان مذہبی آدمی ہے ٹیوب جی ٹائر جی خالص کاروباری اور بنک بیلنس بھائی بہت اونچا آدمی ہے۔ اور اس کے ایک اشارہ سے بازار سرد پڑ جاتا ہے۔

یہ کردار زندگی کے ہر موضوع پر جو کچھ سمجھتے ہیں بولتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔

میں نے کبھی ان کے پردے میں بولنے کی کوشش نہیں کی۔ میں بالکل ——— ایڈیٹر کا نامہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں، کی تصویر بن کر الگ بیٹھ جاتا ہوں۔

ایک مرحلہ ایسا بھی ہے جب میں لکھتے لکھتے محسوس کرتا ہوں جیسے میں لکھ نہیں رہا ہوں بلکہ سائیکل چلا رہا ہوں۔ اور سائیکل بھی سیدھا بندر روڈ پر چلا رہا ہوں۔ گدھا گاڑیاں—کاریں—اونٹ گاڑیاں——ٹرک——موٹر——رکشا——ہاتھ گاڑی——سائیکل——بسیں——ٹرامیں——ٹھیلے——بے پناہ مصروف ٹریفک میں ہر قدم پر بچتے بچتے بریک لگاتے پیڈل پر دباؤ ڈالے بڑھتا ہوں۔

چونکہ میں نے زندگی کا بیمہ نہیں کرایا اس لئے اس قسم کی موت مجھے گوارا نہیں کہ جس میں میرے پسماندگان کو "صبر جمیل" بھی نہ مل سکے۔ میرے سامنے دو چیزیں ہوتی ہیں ایک تو ٹریفک کی بھیڑ بھاڑ سے بچنا اور دوسرا وزن برابر رکھنا۔ اگر میں ایک طرف کو جھکتا ہوں تو گرتا ہوں۔ دوسری طرف وزن بڑھتا ہے تو ہڈی پسلی ٹوٹتی ہے۔ میرے پڑھنے والوں نے شاید اس کو محسوس نہ کیا ہو اور شاید کیا بھی ہو۔ مگر منزل عشق میں دوچار سخت مقام آتے ہیں۔ ان میں ایک یہ بھی ہے فارسی میں اس مقام محمود کو ؎

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

اور اُردو میں ؎

بات پر یاں زبان کٹتی ہے

کہتے ہیں میرے کالم میں سب سے بڑا آرٹ یہی ہے۔ اس فن کی میں نے بڑی مشق کی ہے۔ اس میں نت نئے تجربے کئے ہیں۔ ہوتا کیا ہے کہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر سوچتا ہوں کہ یوں کہوں کہ جیسے میں نے کہہ بھی دیا اور کچھ بھی نہیں کہا——سمجھنے والے سمجھ جاتے ہیں۔ جاننے والے جان جاتے ہیں۔ بھناتے ہیں۔ مگر کچھ نہیں نہیں پاتے۔

بات کرنے کا موقعہ ملا ہے تو اپنے کالم کے متعلق کچھ اور عرض کر دوں۔

میرے نزدیک مزاح وہ ہے جس میں ابتذال نہ ہو۔ یعنی گراوٹ کی کوئی بات نہ ہو۔ یعنی سائیکل چلانے والی بات ہے۔ یہ معاملہ مصروف ٹریفک سے زیادہ الجھا ہوا ہے۔ یوں سمجھئے کہ ایک طرف کھڈ ہے اور دوسری طرف کھائی۔ ان کے بیچوں بیچ ایک پگڈنڈی پر سائیکل چلانا ہے۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں ایک بار بھی گرا نہیں کیونکہ تقاضائے بشریت بھی تو ساتھ ہے۔ بہرحال میرے کالم میں آپ کو ابتذال نظر نہیں آئے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب میں لکھتا ہوں تو اس وقت میرے ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ اسے مائیں پڑھتی ہیں، بہنیں پڑھتی ہیں، بیٹے پڑھتے ہیں، بزرگ پڑھتے ہیں اگرچہ فحاشی آج کل آرٹ کا دوسرا نام ہے۔ لیکن آپ اس سلسلے میں مجھے "قدامت پسند" کی گالی دے کر جی کا بوجھ ہلکا کر لیجئے۔

مزاحیہ کالم میں لطیفوں سے بھی گذارا ہو سکتا ہے

زبان کا سہارا بھی لیا جا سکتا ہے۔

پرانی کتابیں مثلاً "فسانہ آزاد" وغیرہ کے فقرے

بھی دیئے جا سکتے ہیں۔

عبارت کو ثقیل بھی بنایا جا سکتا ہے۔

اشعار بھی کثرت سے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔

لیکن میں نے اپنے کالم کو ان چیزوں سے بالکل پاک رکھا ہے۔ میں جو کچھ دیکھتا ہوں لکھتا ہوں۔ اور جس طرح بولتا ہوں اسی طرح لکھتا ہوں۔ کسی تکلف کسی بناوٹ کسی تصنع سے کام نہیں لیتا۔ میرا کالم عوام کا کالم ہے ___ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ میرا کالم ___ میرا کالم ہے ___ کیوں کہ اس میں جو کچھ ہوتا ہے وہ میرا نہیں بلکہ ماحول کا ہوتا ہے۔ ماحول سے میں جو کچھ لیتا ہوں اسے واپس کر دیتا ہوں۔ طنز و مزاح کے سلسلے میں ایک چیز خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ وہ یہ کہ ذاتیات میں الجھ کر دل شکنی اور دل آزاری نہ کی جائے، صرف اصولی بحث کی جائے۔ اگرچہ اندھی مخالفت کی رو میں بہہ کر ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگ گالیوں تک اتر آتے ہیں لیکن گالیاں دینا کسی ملک میں بھی آرٹ نہیں کہلاتا۔ اگر یہ آرٹ قرار پا جائے تو ہر ایرا غیرا نتھو خیرا بہت بڑا آرٹسٹ بن جاتے!

(۲۳ و ۲۴ رجون ۱۹۵۶ء)

جمہوری تقاضے

"_____ یہ دور "سلطانیٔ جمہور" کا ان معنوں میں نہیں ہے کہ ہم ہر اس "نقشِ کہن" کو جو ہمیں نظر آتا ہے، مٹا سکیں لیکن یہ "جمہوری تقاضوں" کا دور ہے اور ہم لوگ مداری کے "بچہ جمہورا" کی طرح "بچہ جمہورا" بن گئے ہیں۔ ہر بات جمہوری تقاضوں کے لئے ہوتی ہے ہر آدمی کی آواز "پبلک" آواز ہے۔

⁘ _____ اگر ہم کسی جماعت سے نکلتے ہیں تو _____ جمہوری تقاضوں کے لئے۔

⁘ _____ ایک نئی جماعت بناتے ہیں تو _____ جمہوری تقاضوں کیلئے

⁘ _____ جب نئی جماعت نہیں چلتی تو پھر اسی جماعت میں

آتے ہیں جس کو ہم کل تک بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔
تو جمہوری تقاضوں کے لئے ——————

⁘ —— جماعت کی نئے سرے سے تنظیم کرتے ہیں —— تو
جمہوری تقاضوں کے لئے ——————

انگریز کے دور کو تو ہم خلاف جمہوریت کہتے تھے اور اس کے ہر عمل کو ظلم و تشدّد قرار دیتے تھے۔ مگر آج کے دور میں:-

⁘ —— دفعہ ۱۴۴ لگتی ہے تو —— جمہوری تقاضوں کے لئے
⁘ —— گولی چلتی ہے تو —— جمہوری تقاضوں کے لئے
⁘ —— لاٹھی چارج ہوتا ہے تو —— جمہوری تقاضوں کے لئے
⁘ —— سیفٹی ایکٹ لگتا ہے تو —— جمہوری تقاضوں کے لئے
⁘ —— مارشل لاء لگتا ہے تو —— جمہوری تقاضوں کے لئے

اور دوسری طرف ان تمام اقدامات کی مخالفت اور شہری آزادی کی حمایت ہوتی ہے تو جمہوری تقاضوں کے لئے۔

عرض یہ ہے کہ

⁘ —— ہمارا چلنا۔ پھرنا۔ کھانا۔ پینا۔ سونا۔ جاگنا۔ اٹھنا۔ بیٹھنا۔ اوڑھنا۔ بچھونا سب جمہوری تقاضوں کے لئے ہے۔

دوسری طرف جمہور کی کیفیت یہ ہے کہ وہ جمہور کم اور "منظور" زیادہ ہے۔ اور اب تو ہر جلسہ ایک ڈرامہ ہے جس

کا نام ہے :-

"جمہور عرف منظور"

:.— کراچی کا "آرام باغ" اور "جہانگیر پارک" -
"منظور باغ" اور "منظور پارک" ہے -

:.— لاہور کا موچی دروازہ — "منظور دروازہ" ہے

:.— پشاور کا چوک یادگار — "چوک منظور" ہے

:.— راولپنڈی کا کمپنی باغ — "منظور باغ" ہے

غرضیکہ ہر شہر کا وہ مقام جہاں عموماً جلسے ہوتے ہیں جلسہ گاہ نہیں - بلکہ "منظور گاہ" ہے - وہاں سے کوئی کبھی مایوس ہو کر نہیں آیا - بلکہ "منظور گاہ" ہے - وہاں سے کوئی کبھی مایوس ہو کر نہیں آیا - جو قرارداد پیش کیجئے

لوگ کہتے ہیں !

"منظور ہے" !

"منظور ہے" !

آپ ہر شہر میں دو جلسوں کا انتظام کیجئے - ایک جلسہ میں یہ قرارداد پیش کیجئے کہ -

"اس ملک میں صحیح معنوں میں جمہوری نظام قائم ہونا چاہیئے -"

اور اس کی حمایت میں تقریریں کرائیے کہ ڈکٹیٹرشپ تباہی کی طرف لے جاتی ہے - اس سے عوام کی بھلائی نہیں ہوتی - اقتدار

جن لوگوں کے ہاتھ میں آ جاتا ہے وہ مزے کرتے ہیں ۔عوام بھوکوں مرتے ہیں ۔ جاگیرداری ، سرمایہ داری ختم کرو اور زمین ، صنعت اور دوسری چیزوں کو قومی ملکیت بناؤ ۔ وغیرہ ۔

آپ یقین کیجئے لوگ قرارداد سے اتفاق کریں گے اور جب صدر کہے گا !

"منظور ہے ۔" ؟

ہر طرف سے آوازیں آئیں گی !۔

"منظور ہے" !

"منظور ہے" !

دوسرا جلسہ آپ "ڈکٹیٹرشپ" کی حمایت میں کیجئے اور اس میں یہ قرارداد پیش کیجئے !

"اس ملک میں "ڈکٹیٹرشپ" قائم ہونی چاہیئے کیوں کہ ہم ابھی جمہوری نظام کے اہل نہیں ہیں ۔"

اور اس قرارداد کی حمایت میں بھی تقریر کرائیے کہ تجربہ نے ثابت کیا ہے کہ ہم جمہوریت کے اہل نہیں ہیں ۔ ہمارے معدے صدیوں کی غلامی کے سبب جمہوریت ایسی ثقیل چیز کو ہضم نہیں کرسکے ۔ ہمیں اپنے فرائض کا احساس نہیں ہے ہر شخص اپنے مفاد کے لئے قوم کو تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے ۔ یہ چوربازاری ۔ یہ اسمگلنگ یہ رشوت ستانی ۔ یہ ذخیرہ اندوزی ۔ یہ ناجائز منافع خوری سب

اس وجہ سے چل رہی ہیں۔ کہ کوئی مضبوط ہاتھ اس کو روکنے کے لئے نہیں ہے۔ جو لوگ ان جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں اگر ان کے خلاف کارروائی ہوتی ہے تو سفارشیں پہنچ جاتی ہیں۔ چونکہ حکومت کرنے والے ان لوگوں سے ووٹ لیتے ہیں۔ اس لئے ان کو ناخوش کرنا نہیں چاہتے۔ لاہور میں مارشل لاء کے دنوں میں سب چیزیں ٹھیک ہو گئی تھیں۔ یہ تجربہ نہایت کامیاب رہا۔ مہنگائی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد آپ یہ کہئے کہ ترکی میں اتاترک مصطفٰے کمال جیسا آدمی پیدا ہوا جس نے چند دن میں اس "مرد بیمار" کو زندہ کر دیا۔ سب "ڈکٹیٹرشپ" کی برکت تھی۔ ہٹلر نے اپنی قوم کو زندہ کر دیا۔ اسٹالن اپنے ملک کا "عوامی ڈکٹیٹر" تھا۔ اس نے روس کو زندہ کر دیا۔

پھر صدر جلسہ اعلان کریں !۔

"بھائیو! یہ قرارداد آپ کو منظور ہے ؟"

اس پر ہر طرف سے آوازیں آئیں گی !۔

"منظور ہے !"

"منظور ہے !"

صدر جلسہ اگر کہیں گے !۔

"کوئی صاحب اگر اس کے خلاف ہوں تو ہاتھ کھڑا کریں ؟"

یقین کیجئے کہ ایک بھی ہاتھ اس کے خلاف نہیں اٹھے گا۔

شاید اس ڈر سے کہ جب سب لوگ "منظور ہے" کہہ رہے ہیں تو اختلاف کرنے سے کہیں بھرے جلسے میں "پٹائی" نہ ہو جائے ہاں تو جب جمہور کی کیفیت یہ ہو کہ وہ ہر رہبر کے ساتھ تھوڑی دور چلے اور رہبر کو نہ پہچانے تو پھر جمہوری تقاضوں کے لئے جو کچھ بھی کیا جائے وہ —

"سیٹھ ٹیوب جی ٹائر جی" کی زبان میں — "سب چلے گا"

کیوں ——؟

اس لئے کہ —— نہ کوئی روکنے والا ہے
نہ کوئی ٹوکنے والا ہے

جمہوری تقاضے ———— زندہ باد

(۲۰ رجون ۱۹۵۶ء)

اُسترے کے سائے میں

" میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے میں کسی "ہیر کٹنگ سیلون" میں شیو نہیں بنواؤں گا۔ البتہ بال ترشوانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اگرچہ میں ہمیشہ غسل خانہ میں گنگناتا رہا ہوں۔ جی ہاں۔ اقبالؔ کا یہ شعر میں نے اکثر غسلخانے میں گنگنایا ہے ؎

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

لیکن عملی طور پر ایسا نہیں ہوا۔ یہ تو تیغ کا سایہ ہے مجھ میں اُسترے کے سائے میں بھی جوان ہونے کی ہمت نہیں۔

اپنی اس کمزوری کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب میں ایک "ہیئر کٹنگ سیلون" میں شیو بنوا رہا تھا۔ بار بر نے صابن کے جھاگ کی تہہ جمائی اور کہنے لگا :۔

"بابو جی! جماعت اسلامی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے!" میں نے کہا!

"ارے بھائی! ہم تو داڑھی منڈے ٹھہرے ہم کیا جواب دیں؟" پھر اس نے خود ہی کہا :۔

صاحب! ہم تو اس کے حامی نہیں ہیں۔ سب سے زیادہ آمدنی تو ہمیں "شیو" بنانے سے ہوتی ہے۔ یہ ہماری روٹی کا سوال ہے۔"

میں نے کہا! "ہاں بھائی! تم ٹھیک کہتے ہو۔"

یہاں تک تو خیریت تھی کیوں کہ ابھی صابن جھاگ چھوڑ رہا تھا۔ برش پوری رفتار سے چل رہا تھا۔ جھاگ کی تہہ جم رہی تھی۔ اب باربر نے اُسترا تیز کرنا شروع کیا۔ یہ مرحلہ بھی بخیر و عافیت طے ہو گیا۔

باربر نے کہا۔ "ذرا ٹھیک سے بیٹھئے۔"

میں ٹھیک سے بیٹھ گیا۔ اب استرا چلنے لگا۔

چل مرے ریزر بسم اللہ

استرا چل رہا تھا اور میں آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ باربر نے کہا:۔
"بابو جی! ذرا گردن جھکائیے؟"
میں نے کہا:۔
"اے میرے پیارے باربر! کون ہے جو تیرے سامنے گردن جھکانے سے انکار کرے؟ بڑے بڑے لوگ جن کی گردن شاید خدا کے آگے بھی نہیں جھکی تیرے سامنے جھکتے ہیں۔ اے میرے پیارے باربر! تیرے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم ہے۔"
یہ کہہ کر میں نے گردن جھکا دی۔ استرا چلتا رہا۔ میری گردن جھکی تو باربر کی گردن خوشی سے تن گئی!
خیر یہ مرحلہ بھی خیریت سے گزر گیا۔ میں آئینے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ باربر نے کہا:۔
"بابو جی! کون سی اچھی پکچر چل رہی ہے آج کل۔؟"
میں نے جواب دیا:۔
"بھائی میں سینما بہت کم دیکھتا ہوں اور میرا اصول یہ ہے کہ ایک وقت میں ایک گناہ کروں۔ مولوی گلشیر خان نے کہا ہے کہ سینما دیکھنا گناہ ہے پیر علی محمد راشدی نے کہا ہے کہ اخلاق بگڑتا ہے عریاں تصویریں دیکھ کر۔ خیر میں مانتا ہوں کہ یہ گناہ ہے۔ لیکن میرے خیال میں پیسے خرچ کر کے سینما

دیکھنا "گناہ کبیرہ" ہے۔ ایک تو سینما دیکھنے کا گناہ۔ دوسرے اسراف کا گناہ۔ اس لئے اگر پاس مل جائے تو میں ایک گناہ کر لیتا ہوں۔ دوسرے گناہ یعنی اسراف کا مرتکب نہیں ہوتا بلکہ میں نے ایک شعر بھی کہا تھا:۔

یہ جی میں ٹھانی ہے ہم نے "پکار" دیکھیں گے
جو پاس ملتا رہا بار بار دیکھیں گے

باربر نے کہا:۔

"چلئے آپ نے سینما نہیں دیکھا مگر سُنا تو ہوگا کہ کون سی اچھی پکچر چل رہی ہے ؟"

میں نے کہا:۔

"دیکھو بھائی! سب سے اچھی پکچر کراچی کارپوریشن میں چل رہی ہے جس کا نام ہے۔" ون یونٹ اسمبلی الیکشن عرف کالی منڈی" یہاں ہر دوسرا سٹی فادر امیدوار ہے۔ بہرحال دیکھئے "اونٹ" کے وزن پر "یونٹ" کس کروٹ بیٹھتا ہے، اب تو لوگ:۔

"اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی" کی بجائے!

"یونٹ رے یونٹ تیری کون سی کل سیدھی"

کہہ رہے ہیں اچھی پکچر تو بس یہی ہے۔ اور ایک جگہ نہیں بلکہ ایک ساتھ کئی جگہ اس کا نام ہے:۔

"مجید لاہوری کی حرف و حکایت"

"مسلم لیگ عرف چیونٹیوں بھرا کباب"

سنا ہے ۔ کہ اس پکچر میں جان نکالنے والے جان ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اگرچہ جان ڈالنا خدا کا کام ہے مگر انسان بھی ترقی کر رہا ہے ۔"

اب استرا میرے گلے پر آگیا تھا ۔ باربر نے کہا :-

"بابو جی آپ مسلم لیگ کے حامی ہیں یا عوامی لیگ کے ؟"

میں نے کہا :-

"ارے میرے پیارے باربر ! پیشتر اس کے کہ میں اس سوال کا جواب دوں تو خدا کے لئے استرا میرے گلے سے ہٹالے تیسرے اس "سیفٹی ایکٹ" کی موجودگی میں کوئی جواب نہیں دے سکتا ۔"

باربر نے گلے سے استرا ہٹایا ۔ تو میں نے کہا :-

"پیارے باربر! تم ان دونوں میں سے کس کے ساتھ ہو؟"

باربر نے کہا :-

"اجی ہم تو اس کے ساتھ ہیں جو ہم غریبوں کا بھلا کرے ۔ ہر کوئی اپنا بھلا کرتا ہے دوسرے کی بھلائی کی بات نہیں کرتا ۔ ایمان کی بات یہ ہے ہم کسی کے ساتھ نہیں ۔ صرف اس کے ساتھ ہیں جو ہمارا بھلا کرے۔"

میں نے کہا

"میرے پیارے باربر! تو بالکل ٹھیک کہتا ہے۔ رمضانی
کا بھی یہی خیال ہے!"

خیر استرا پھر چلنے لگا اور خدا کا شکر ہے کہ اس نے پھر گلے پر استرا رکھ کر مجھ سے کوئی سوال نہیں پوچھا۔ اب میں ڈر گیا ہوں۔ اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ کہ چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے میں کسی "ہیئر کٹنگ سیلون" سے "شیو" نہیں بنواؤں گا۔ اب میں "شیو" کا سامان خرید لایا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے گلے پر کوئی استرا رکھ کر مجھ سے میری رائے پوچھے۔ میں جانتا ہوں کہ اختلاف کی صورت میں استرے سے گلا کٹ سکتا ہے۔ یہ میری کمزوری ہے اور اس کا مجھے اعتراف ہے۔ میں اب بھی غسل خانے میں گنگناتا ہوں ؎

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جوان ہوئے ہیں
لیکن صاحب۔ میں استرے کے سائے سے پناہ مانگتا ہوں؟

(٦ رجنوری ۱۹۵۶ء)

گیا انگریز لیکن اسکی انگریزی نہیں جاتی

"ــــــــ مولوی گلشیر خان ــــ بہت خوش ہیں کہ پاکستان کا آئین قرآن و سنت کے مطابق ہوگا۔ بھوکوں کو روٹی۔ ننگوں کو کپڑا۔ بے گھروں کو گھر۔ بے کاروں کو کام۔ بیماروں کو دوا جاہلوں کو تعلیم ملے گی۔ ہمسایہ اگر بھوکا ہوگا تو کوئی شخص اس وقت تک کھانا نہیں کھائے گا جب تک اس کو نہ کھلائے۔ مزدور کی محنت کا معاوضہ قبل اس کے کہ اس کا پسینہ خشک ہو ادا کیا جائے گا۔ مولوی گل شیر خاں کہتے ہیں۔ یہ آئین جلد سے جلد منظور ہونا چاہیئے سرخ لوگ، عوامی لوگ، اور ہندو کانگریس کے لوگ نے "جوسنگھٹن" بنایا ہے اس کی کوشش کو

نکالا بنانا چاہیئے ۔ مگر مولوی صاحب کو شکایت ہے کہ انگریز چلا گیا ہے لیکن اس کی "انگریزی" ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتی ۔ یعنی گورے چلے گئے مگر اپنی اولاد چھوڑ گئے ۔ مولوی گل شیر خان نہ اُردو کے حامی ہیں نہ بنگلا کے اور نہ انگریزی کے ۔ وہ کہتے ہیں کہ قومی زبان عربی ہونی چاہیئے تاکہ ہم کہہ سکیں کہ ــــ "اے پاک سرزمین ، اے کشور حسین !

ع تری آواز مکے اور مدینے

میں نے کہا ــــ مولوی صاحب ! آپ کا ارشاد بالکل درست ہے بالکل بجا ــــ بلکہ ع

"ہر کہ شک آرد کافر گردد !"

مگر یہ تو سوچیئے کہ اس کے لئے کتنا عرصہ درکار ہوگا؟ زبان ایسی ہونی چاہیئے جس کو رمضانی بھی بول سکے اور سمجھ سکے ۔ عمل کا ذکر آپ چھوڑ دیجئے ۔ آپ اور ہم سبھی اس حمام میں ننگے ہیں مگر یہ بھی تو دیکھئے کہ ہم سب قرآن پڑھتے ہیں ہر صبح تلاوت کرتے ہیں لیکن کتنے لوگ ہیں جو قرآن کو سمجھتے ہیں ؟ جب سمجھتے ہی نہیں تو عمل کیا کرینگے خاک ــــ ان کا ذکر چھوڑ دیجئے جو قرآن پڑھتے ہیں اور سمجھتے نہیں ، یہاں تو جو لوگ سمجھتے بھی ہیں وہ بھی اس پر عمل نہیں کرتے ۔

بلکہ ع

"چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند"

اس کے باوجود کیفیت یہ ہے کہ ہم گناہ گار لوگ ہیں گردن زدنی ٹھہرتے ہیں۔ ایک شخص مے نوشی کرتا ہے۔ یقیناً بُرا کرتا ہے۔ کیوں کہ شراب حرام ہے دوسرا شخص مُردوں کا مال کھاتا ہے۔ وہ بھی بُرا کرتا ہے۔ کیوں کہ مردوں کا مال کھانا حرام ہے۔ مردے کی بات یہ ہے کہ رند تو اپنے گناہ پر نادم ہے مگر مردوں کا مال کھانے والا اپنے زہد و اتقا پر نازاں ہے۔ میں نے کہا مولوی صاحب! اسی مضمون پر میرا ایک تازہ قطعہ سنئے ؎

رند مے پی کے لڑکھڑاتا ہے
شیخ مردوں کا مال کھاتا ہے
یہ تو اپنے کئے پہ نادم ہے
اور وہ منبر پہ دندناتا ہے

مولوی صاحب نے کہا — ارے بھائی! تم تو ہر بات میں شاعری کرتے ہو۔

میں نے کہا — مولوی صاحب قبلہ! یہ شاعری نہیں حقیقت ہے۔

آئیے ہم دونوں اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں۔

خیر۔ مولوی گل شیر خان یہ تو مانتے ہیں کہ عربی کو قومی زبان بنانے میں بڑا وقت لگے گا اور شاید ایک صدی کے بعد بھی رمضانی اس قابل نہ ہو سکے گا کہ وہ اس زبان کو اہلِ عرب کی طرح بول اور سمجھ سکے مگر انہیں سب سے بڑا اعتراض انگریزی پر ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

"گیا انگریز لیکن اس کی "انگریزی" نہیں جاتی"

میں نے کہا مولوی صاحب! آپ کیوں انگریزی کے منہ آتے ہیں۔ مجھے تو یہ بڑی پیاری معلوم ہوتی ہے۔ یہ گوری زبان ہی نہیں بلکہ "گوری کا جوبن" بھی ہے۔ اگر میرے بس میں ہو یعنی مطلب یہ ہے کہ جیب میں ذرا "ناں واں" ہو تو میں "انگریزی" سے شادی کر لوں۔ آخر لوگ دوسری شادی کرتے ہیں اور شرعاً یہ جائز بھی ہے میں تو کہتا ہوں ؎

کیا ہوا رنگ ہے اگر کالا
منہ میں گوری زبان ہے پیارے

مولوی صاحب نے کہا ——— "دیکھئے پھر آپ شاعری کرنے لگے۔؟

میں نے کہا۔ "مولوی صاحب شاعری ہی تو کر رہا ہوں کوئی عربی سلسلہ تو نہیں ہے۔"

بہرحال میں نے مولوی صاحب کو سمجھایا کہ دیکھئے مولوی صاحب اگر اُردو اور بنگالی کو قومی زبان بنایا جائے اور انگریزی کو سمندر پار کا ٹکٹ دیا جائے تو اس میں ہمارا بڑا نقصان ہے۔

کہنے لگے ــــ نقصان کیسے ہے؟

میں نے کہا مولوی صاحب قبلہ ــــ یہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ سوچنے کی بات ہے۔

دیکھئے "صاحب لوگ" نے تو بری بھلی زندگی گذاری — سوال ان کے "بچہ لوگ" کے مستقبل کا ہے جو ولایت میں پڑھ رہے ہیں ــــ اگر اُردو آ گئی یا بنگلہ آ گئی۔ تو رمضانی کے "بچہ لوگ" کو "گولڈن چانس" ملے گا۔ اپنے بچوں کے ساتھ کس کو محبّت نہیں۔ مثلاً آپ کا بچّہ بھی انگریزی پڑھ رہا ہے۔ سوٹ بوٹ پہنتا ہے۔ شیو بناتا ہے۔ ہیٹ لگاتا ہے اس کا بھی تو خیال رکھئے۔ اگر اُردو یا بنگلہ ہو گئی۔ تو وہ کیا کرے گا؟ جبھی تو میں کہتا ہوں کہ اس میں سراسر نقصان ہے۔

مولوی صاحب نے کہا۔ میں قوم پر اپنے بچے کو قربان کرنے کے لئے تیار ہوں۔ یہ تو اسوۂ خلیلؑ ہے۔

میں نے کہا ــــ اجی مولوی صاحب! ہر آدمی تو اسوۂ خلیل پر عمل نہیں کرتا۔ صاحب لوگ کا۔ "بچہ لوگ" کیا کرے

گا؟ اُردو یا بنگلہ تو ہر آدمی پڑھے گا۔ مگر انگریزی تعلیم پر اور خصوصاً "اعلیٰ تعلیم پر جو خرچ اٹھتا ہے وہ تو" صاحب لوگ ہی دے سکتا ہے۔ اب آپ انگریزی کی مخالفت کرکے صاحب کے "بابا لوگ" کے "گولڈن چانس" کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ معاف کیجئے میں آپ سے اس سلسلہ میں متفق نہیں ہوں۔

آپ جانتے ہیں کہ صاحب کا "بچہ لوگ" نہ صرف یہ کہ انگریزی بولتا ہے بلکہ ولایت کے سانچہ میں ڈھل گیا ہے۔ وہ۔ "ڈیم کالا آدمی" سے بات نہیں کرتا۔ ہاں جب اپنا "ڈیم کالا سرونٹ" سے انڈا منگواتا ہے تو کہتا ہے :۔

"یو ڈیم ایڈیٹ! میم صاحب کا واسطہ مرغی کا بابا لوگ لانا مانگتا۔" بلکہ ایک بار "صاحب کا بچہ لوگ" کو گدھی کے دودھ کی ضرورت پڑی۔ "ڈیم کالا سرونٹ" کہیں سے گدھا پکڑ کر لے آیا۔ "بچہ لوگ" کا پارۂ حرارت اونچا ہو گیا نوکر سے کہا !۔

"یو ڈیم فول ـــــ تم ہمارا مانک کیوں لایا۔ میم صاحب کا مانک لاؤ"

بہرحال میں مولوی گلشیر خاں کی رائے سے متفق نہیں ہوں ہاں مجھے خوشی ہے کہ ابھی بیس برس تک ہمارا "جونا صاحب لوگ"

کا "لینگویج" چلے گا۔ اور تو اور کلب کا بیرا بھی کہتا ہے:۔
"دیکھو مین یہ لوگ انگلش کو کیوں "اپوز" کرتا ہے؟"
آخر میں مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ:۔

"اے کامن ویلتھ کی مادر مہربان! ہم تیرے وفادار ہیں کہ آزادی کے دور میں بھی بڑی مادر مہربان ملکہ وکٹوریہ کی زبان میں بات کرتے ہیں۔ ہمارا اسلامی آئین بھی اسی زبان میں بنا ہے۔ اے مادر مہربان! دعا کر کہ تیرے سایۂ عاطفت میں ہم دودھوں نہائیں پوتوں پھلیں۔"

(۱۴ر جنوری ۱۹۵۶ء)

دُور کی کوڑی

میں سوچ رہا تھا کہ سات آٹھ روز سے رمضانی بالکل چپ ہے۔ اس سے پہلے جب کبھی وہ آتا تھا پہروں باتیں کیا کرتا تھا۔ آخر میں نے آج اس سے پوچھ ہی لیا:۔

"کیا بات ہے رمضانی ؟ ہفتہ بھر سے تم خاموش ہو۔
کیا تم نے گونگے کا گڑ کھا لیا ہے یا چپ شاہ کا روزہ
رکھ لیا ہے ؟"

رمضانی نے کہا !۔

"——— نہیں بابو جی ! یہ بات نہیں ۔ بات اصل میں یہ ہے کہ اب میں سوچ رہا ہوں ۔ اس سے پہلے جب سوچتا

نہیں تھا تو بے سوچے سمجھے جو کچھ ذہن میں آتا تھا کہہ دیتا تھا۔ مجھے سوچنے کے بعد معلوم ہوا ہے کہ جو لوگ سوچتے ہیں وہ بہت کم بولتے ہیں۔ اور جو نہیں سوچتے وہ بولتے ہیں اور بے تکان بولتے ہیں۔!"

میں نے کہا !۔

"رمضانی ! یہ تجھے سوچنے کی کیا سوجھی ؟ سوچنے والے سوچتے رہیں گے تو کیوں مفت میں ہلکان ہوتا ہے ؟ سوچنے سے پریشانی ہوتی ہے۔ وسوسے بڑھتے ہیں۔ سر چکرانے لگتا ہے۔ دل ڈوبنے لگتا ہے۔ اور کبھی کبھی دن میں تارے بھی نظر آتے ہیں۔ یہ بہت بری بات ہے جب بے سوچے بھی کام چلتا ہے تو ناحق پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے ؟"

رمضانی نے کہا!۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں بابو جی ! واقعی سوچنے سے پریشانی ہوتی ہے۔ اور جب سے میں سوچنے کی مشق کر رہا ہوں کئی بار کھوپڑی چٹخ چٹخ گئی ہے۔ کئی بار محسوس ہوا ہے۔ جیسے دماغ کی چولیں ڈھیلی ہو رہی ہیں۔ کبھی کبھی مجھے سائے رقص کرتے نظر آئے ہیں۔ کانوں میں یوں آوازیں گونجی ہیں۔ جیسے بیدھا بندر روڈ پر کار، ٹرک، اونٹ گاڑی، موٹر گاڑی، موٹر سائیکل رکشا،

گدھا گاڑی اور سائیکل کی ایک ساتھ ٹکر ہو گئی ہے ۔ ان سب کے ٹکرانے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے ۔ بس ویسی ہی آوازیں میرے کانوں میں گونجتی ہیں ۔ جتنا سوچتا ہوں اتنا ہی پریشان ہوتا ہوں آپ جانتے ہیں کہ جب کام دھندا چالو تھا میں خود کو مصروف رکھتا تھا ۔ اتنا مصروف کہ سر کھجانے کی فرصت نہیں تھی ۔ اس لئے کبھی سوچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا ۔ لیکن جب سے کام دھندا چوپٹ ہو گیا ہے ۔ وقت گزارنے کا بھی یہی مشغلہ ہے کہ سوچا جائے ۔ اور مسلسل سوچا جائے ۔ پہلے وقت آپ سے آپ کٹ جاتا تھا اب سوچتا ہوں اور وقت کاٹتا ہوں ۔ چلتے ، پھرتے ، اٹھتے بیٹھتے ، سوتے جاگتے سوچتا ہوں ۔ حتیٰ کہ نیند میں بھی سوچنے کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے ۔ جیسے میں جاگ رہا ہوں ۔"

میں نے کہا ! ۔

"رمضانی ! تم جانتے ہو کہ بے کار دماغ شیطان کا کارخانہ ہوتا ہے ۔ مجھے یہ سنکر بڑی تشویش ہوئی کہ تم بھی سوچنے لگے ہو ۔ خدا جانے تم کیا سوچتے ہو ، اور دیکھو بھائی ! یہ سوچنے ووچنے کا کام ہمارا نہیں ۔ یہ ان لوگوں کا کام ہے جو ہمارے لئے سوچتے ہیں اور وہ بنی بنائی کے وزن پر "سوچی سوچائی" چیزیں ہمیں دیتے ہیں ۔ ہمارا تمہارا سوچنا فضول ہے اور پھر اگر ہم سوچیں

بھی تو کیا کر سکتے ہیں ؟ جب کر نہیں سکتے تو سوچنا ہی بے معنی ہے ۔ اس لئے خدا کو مانو اور سوچنا چھوڑ دو ۔ ورنہ اس جرم میں دھر لئے جاؤ گے ۔ اور اخباروں میں خبر چھپے گی کہ حسن علی آفندی روڈ کے فٹ پاتھ نمبر ۲ پر ایک آدمی کو گرفتار کر لیا گیا ۔ معلوم ہوا ہے کہ وہ سرِ عام گھٹنوں میں سر دے کر سوچ رہا تھا ۔"

گفتگو بہت طویل ہو چکی تھی ۔ میں نے سوچا کہ اب اس سلسلہ کو کچھ مختصر کر دیا جائے اور رمضانی سے پوچھا جائے کہ اس نے کیا سوچا ؟ چنانچہ میں نے اس سے کہا :۔

"دیکھو بھائی ! اب مجھے لکھنا ہے ۔ وقت بہت ہو چکا ہے ۔ تم یہ بتاؤ کہ آٹھ دن میں تم نے آخر کیا سوچا ۔؟"

رمضانی نے کہا !۔

"—— بابو جی ! آٹھ دنوں میں یقین کیجئے کہ میں نے چلتے پھرتے ، اٹھتے ، بیٹھتے ، سوتے جاگتے ۔ مسلسل سوچا ۔ ٹرام میں بیٹھ کر ۔ بس میں بیٹھ کر ۔ ہوٹل میں بیٹھ کر ۔ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر ۔ نیٹی جیٹی کے پُل پر بیٹھ کر ۔ حتیٰ کہ ، بیت الخلاء میں بیٹھ کر ۔ میں نے سوچا اور سوچنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ —— "یہ دنیا فانی ہے ،

میں نے کہا !۔

"ارے بھائی ! اتنی سی بات سوچنے کے لئے تم نے اپنی زندگی کے آٹھ دن ضائع کر دیئے۔ یہ بات تو لوگ برسوں سے کہہ رہے ہیں ؟"

رمضانی نے کہا !۔

"بابو جی بہت ہی افسوس ہے کہ آپ نے میری محنت کی داد نہیں دی اور سب کیا دھرا خاک میں ملا دیا۔کم ازکم یہ تو سوچئے جو بات لوگوں نے برسوں میں سوچی وہ میں نے آٹھ دن میں سوچ لی ۔ اور یہ بات آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ یہ الہامی طور پر میرے ذہن میں آئی ۔ میں نے یوں محسوس کیا جیسے کوئی سفید ریش بزرگ سبز کپڑے پہن کر ہاتھ میں عصا تھامے میرے سامنے آیا ہے اور کہہ رہا ہے ۔

● ——— "ارے رمضانی"

'یہ دنیا ہے فانی'

اسی وقت میں نے کہہ دیا کہ !۔

● ——— دنیا فانی ہے

یعنی ؎

یہ دولت آنی جانی ہے

یہ دنیا رام کہانی ہے

میں نے اس وقت کہا کہ جمعہ بلوچ پان والے کی دوکان پر لکھا ہے !۔

"رہے نام اللہ کا"

یہ دنیا فانی ہے ـــ اور ـــ رہے نام اللہ کا !

میں واقعی رمضانی کا قائل ہو گیا کہ وہ آٹھ دن تک سوچنے کے بعد کتنی دور کی کوڑی لایا میرے خیال میں اس نے وقت ضائع نہیں کیا۔

(۲۵ ر نومبر ۱۹۵۶ء)

بمبئی بجار میں

"—— دیکھو رجو بھائی! — ہم تم کو بولا تھا ہمارا سیٹھ یہ جو یونٹ کا اسمبلی میں لوگ ووٹ ڈالنا پڑا ہے۔ اس میں ہمارا سیٹھ کو "کرسی" ملے گا۔ تم بولا کہ ممد بھائی! تمہارا سیٹھ تو "پڑھیلا" نہیں ہے۔ ہم تم کو بولا "پڑھیلا" نہیں ہے تو کیا ہے؟ اب "پالٹیکس" بدل گیا ہے۔ اب تو ادھر پیسہ چلتا ہے جو "کھرچہ" کرے گا اس کو اِجّت ملے گا۔ اس کو کرسی ملے گا۔ تمہارا بات بروبر ہے کہ "پڑھیلا آدمی" کونسل میں کام کر سکتا ہے ادھر "بج نس" تو نہیں چلتا ہے "مگج" چلتا ہے۔ پر اب وہ "جمانہ" نہیں ہے۔ پہلے وہ آدمی

لیڈر بنتا تھا۔ جو "پڑھیلا" ہوتا تھا۔ تقریر کرتا تھا۔ جلسہ کرتا تھا اور "لیکھ" لکھتا تھا۔ اب وہ "جمانہ" نہیں ہے۔ اب پیسے کا "جمانہ" ہے۔ کھالی "پڑھیلا" ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ "پھوکٹ" میں تو کام نہیں چلے گا۔ جس کے پاس "کھرچہ" کرنے کو ہے اگر وہ پڑھیلا آدمی کو "انڈر" میں رکھنے سکتا ہے۔ اس سے کام لینے سکتا ہے۔ وہ اس کے واسطے بیان لکھے گا اور "انگریجی" میں ٹائپ کرے گا۔ چھاپے والے کو بھیجے گا۔ ادھر اس کا بیان بھی چھپے گا۔ "پھوٹو" بھی چھپے گا۔ اس میں تو کوئی وانڈہ نہیں ہے۔ سیٹھ نہیں پڑھیلا ہے پر کام تو رکنے نہیں سکتا ہے۔ ہاں اگر "کھرچہ" نہیں کریگا تو کام نہیں چلے گا۔ اب تم دیکھو۔ اسمبلی میں کتنا مل والا گیا ہے۔ کتنا بس والا گیا ہے۔ کتنا جین والا گیا ہے۔ کتنا کارخانے والا گیا ہے۔ وڈیرہ لوگ گیا ہے۔ پیر لوگ گیا ہے سردار لوگ گیا ہے۔ "کڑکا" تو بہت کمتی گیا ہے۔ اس کے پاس پیسہ نہیں ہے تو وہ کیسے جاتے گا؟ ہمارا سیٹھ بولتا ہے کہ اب "جمورت" (جمہوریت) آ گیا ہے۔ "جمورت" اس کو بولتا ہے کہ جتنا آدمی جاستی ہے اس کا جاستی آدمی کو کرسی ملے گا۔ کمتی آدمی کو کمتی ملے گا۔ ہمارا سیٹھ بولتا ہے ہمارا ملک میں "بے پڑھیلا" آدمی جاستی ہے۔ "پڑھیلا" آدمی کمتی ہے۔ پہلے "پڑھیلا آدمی" صوبے وہ "بے پڑھیلا آدمی" کو "چکرم"

بناتا تھا۔ اور "پھوکٹ" میں لیڈر بنتا تھا۔ ہمارا سیٹھ نے بول دیا کہ جاستی آدمی "بے پڑھیلا" ہے۔ اس واسطے اس کا ممبر بھی "بے پڑھیلا" بنے گا۔ تم قسم سے بولو رجو! بھائی کبھی "پڑھیلا آدمی لوگ" بھی "بے پڑھیلا آدمی" کو ووٹ دیا ہے؟ ادھر تو بابا! سب "بج نس" چلتا ہے۔ "پڑھیلا آدمی" کے پاس کیا ہے؟ وہ کسی کو کیا دینے سکتا ہے؟ ہمارا سیٹھ "گریب لوگ" کا کتنا بھلا کرتا ہے۔ جب آدمی لوگ ووٹ ڈالتا ہے۔ وہ ممبری کے واسطے اٹھتا ہے۔ تجوری کو کھول دیتا ہے۔ "گریب لوگ" کو نوٹ دیتا ہے۔ موٹر پر چڑھاتا ہے۔ پلاؤ کھلاتا ہے۔ چائے پلاتا ہے۔ "گریب لوگ" کا دل "کھش" کرتا ہے۔! اس کا بچّہ لوگ کو مٹھائی دیتا ہے اس کا گھر میں جاتا ہے۔ حال پوچھتا ہے۔ "گریب لوگ" کھش ہوتا ہے۔ اور سیٹھ کو ووٹ دیتا ہے۔ اب دیکھو رجو بھائی! تم کو ایمان کا قسم ہے۔ ہم میں کتنا آدمی ہے جو سچّا بات کرتا ہے۔ تو سنا ہے کہ سب لوگ بولتا ہے۔ "اپنا قیمتی ووٹ ہم کو دو" اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ ووٹ قیمت والا "چیج" ہے یہ مفت تو نہیں دے گا۔ "پھوکٹ" میں تو نہیں دے گا۔ جو قیمت دے گا اس کو ووٹ دے گا۔ ادھر "منس پالٹی" میں ووٹ ڈالنا پڑا تھا۔ ہم کو بھی ایک آدمی کارڈ دیا تھا۔ بولا "تم اپنا ووٹ وکیل صاحب کو دو۔ ہم وکیل

ساب کے پاس گیا۔ ہم بولا۔ ہم تم کو ووٹ دے گا پر ہم کو یہ بولو تم ہم کو کیا دے گا؟" وہ بولا۔" ہم تمہارا کام کریگا" ہم بولا! دیکھو کام کا بات کھوٹا ہے۔ جب ووٹ لیتا ہے تو ایسا بات سب کو بولتا ہے۔ پر پچھاڑی میں کوئی کام نہیں کرتا ہے۔ دیکھو تم ہمارا مقدمہ لڑے گا تو "پھوکٹ" میں نہیں لڑے گا پیسہ لے کے لڑے گا۔ تُمہارا وقت قیمتی ہے۔ بولو! ہم تم کو مفت میں کیوں ووٹ دے گا؟ ہم سیٹھ کو دے گا وہ ہم کو پلاؤ کھلائے گا۔ موٹر پر چڑھائے گا۔ نوٹ دے گا۔ اور ووٹ لے گا۔ ادھر تو رجو بھائی! سارا "بج نس" کا بات چلتا ہے۔ جاستی "کھرچہ" کرے گا۔ جاستی ووٹ لے گا۔ اب تو "جموریت" ہو گیا ہے جس کو جاستی ووٹ ملے گا اس کو "کھُدا" اِجّت بھی دے گا۔ کرسی بھی دے گا۔ اب وکیل ساب "پھوکٹ" میں تو ووٹ نہیں لے گا۔ یہ وکیل ساب نہیں ہے "بخیل ساب" ہے ادھر "بخیل" کا کام نہیں ہے دل والے کا کام ہے۔ وہ "جموریت" کھریدے گا۔ اس کو کامیابی ہو گیا۔ دیکھو ہمارا سیٹھ کتنا "کھرچہ" کیا ہے کتنا "جموریت" کھریدا ہے۔ تو اس کو "کھدا" نے کرسی دیا ہے۔ اب آدمی لوگ اس کو مبارک باد دیتا ہے۔ پھول ڈالتا ہے اس کے گلے میں۔ وہ آدمی لوگ کو چائے بھی پلایا۔ پلاؤ بھی کھلایا۔ جو لوگ دارو پیتا

تھا اس کو دارو بھی پلایا۔ "کھرچہ" کیا تو "جموریت" کو کھرید لیا۔ دیکھو رجو بھائی! تم بولتا تھا ممد بھائی کھوٹا بات کرتا ہے۔ ہم سچّا آدمی ہے، کھوٹا بات نہیں کرے گا۔ ہم پہلے بولا تھا ہمارا سیٹھ کو "کرسی" ملے گا۔ تم بولتا تھا وہ "پڑھیلا آدمی" نہیں ہے۔ ہم بولا وہ "پڑھیلا" نہیں ہے پر وہ "ہاتھ کا صفائی" دکھائے گا۔ کیا تم جانتا ہے ادھر کونسل کے اندر آدمی بات بہت کرتا ہے۔ پر "پھیسلہ" ہاتھ سے ہوتا ہے۔ جاستی آدمی جدھر ہاتھ اٹھاتا ہے ادھر کا قانون پاس ہوتا ہے۔ ہمارا سیٹھ "لِکچر" (لیکچر) نہیں کرے گا پر ہاتھ تو کھڑا کرے گا۔ اس نے "ہاتھ کا صفائی" کا دکھا دیا۔ اس کو "کھدا" نے کرسی دیا ہے۔ اب وہ کرسی کا اوپر بیٹھے گا ہاتھ اٹھائے گا۔ اور قانون پاس ہو جائے گا۔ "پڑھیلا" آدمی تو کھالی بات کرتا ہے۔ ٹیم (ٹائم) کھوٹی کرے گا۔ دوسرا کیا کریگا؟ نہیں تو آپس میں لڑے گا۔ کھراب بات کرے گا۔ ہمارا سیٹھ کام کرے گا۔ قوم کا "کھدمت" کرے گا۔ ہاتھ اٹھائے گا اور قانون پاس ہو جائے گا۔

دیکھو رجو بھائی! ہم کو "سٹہ بجار" میں جانا ہے۔ مگر ہم تم کو ایک بات بولے گا۔ تم اپنا بچہ لوگ کو اسکول میں جانے مت دو۔ اس کا کتاب جلا دو۔ وہ پڑھے گا۔ تو کیا کرے گا؟ "جموریت" تو وہ کھرید نہیں کرنے سکتا ہے وہ سالا

کام کرے گا تو چار پیسہ کمائے گا۔ بلیک کا دھندا کرے گا۔ دوسرا دھندا کرے گا۔ کسٹم سے چوری چوری مال لائے گا۔ بیچے گا۔ پیسہ بنائے گا پھر اتنا پیسہ کمائے گا اور ایک مل بنائے گا۔ ادھر سے "سوت" ملے گا۔ اس کو "بلیک" کرے گا پھر —— پھر مشین منگاتے گا۔ مل چلاتے گا —— کپڑا بناتے گا۔ اس میں کماتے گا۔ اور پھر "جموورت" کھریدے گا۔ نوٹ دے گا۔ ووٹ لے گا، ہاتھ اٹھائے گا، تو قانون پاس کرے گا۔ بس رجو بھائیؑ! ہم قسم کھاتا ہے۔ ہم دارو نہیں پیا ہے۔ چرس بھی نہیں پیا ہے۔ گانجہ بھی نہیں پیا ہے۔ تاڑی بھی نہیں پیا ہے۔ ہم ہوش میں بات کرتا ہے۔ اور سچّا بات کرتا ہے۔ تم "بچّہ لوگ" کو اسکول میں پڑھنے کو مت بھیجو۔ یہ سالا لوگ کا جندگی کھراب ہو گا۔

—— اب "جموورت" کا جمانہ" ہے —— "جموورت" کا "بج نس" ہے —— جو "جموورت" کھریدے گا۔ پرمٹ بھی ملے گا۔ ایک روپے کا "کھرچہ" کرے گا —— ایک لاکھ روپیہ کماتے گا —— ہم تم کو جو بولنا تھا بول دیا۔ وہ جو ایک ساعر نے بولا ہے —— کہ ——!

میری جان تم مانتا ہے کہ نہیں مانتا ہے
اگر ہم تم کو نیکی بدی کا بات بتانا پڑا ہے؟

اچھا رمجو بھائی ! ہم کو کھوٹی ہونا پڑا ہے۔
"سلام لیکم" !

(۲۸ر جون ۱۹۶۵ء)

فری اسٹائل

وہ زور بندھا ہے "فری اسٹائل" کا ——— کہ پوچھئے نہیں ——— ! آج صبح بچوں کی ٹولیاں گلے میں بستے لٹکائے گذر رہی تھیں اور قدم قدم پر "فری اسٹائل" کر رہی تھیں اچانک کیا دیکھا کہ پہلے ایک صاحبزادے نے "فٹ پاتھ" پر بستہ رکھ دیا۔ پھر دوسرے نے ——— اس کے بعد ——— آستینیں چڑھ گئیں ماتھے پر بل آئے۔ مٹھیاں بھنچ گئیں۔ سینے تن گئے اور "فری اسٹائل" چالو ہو گیا !۔

★ "ابے سمجھا کیا ہے گھومر نکال دوں گا۔"

★ "جا بے ! بڑا آیا گھومر کا بچہ !— ہٹ جا—— !"

"ابے میں کہتا ہوں —— ہٹ جا بے دنبہ بنا دوں گا مار مار کر ——"

اب کیفیت یہ ہے کہ دیگر "صاحبزادگان" اپنے بستے رکھ کر حلقہ باندھے ارد گرد بیٹھے ہیں اور —— "فری اسٹائل" صاحبزادگان اکھاڑ پچھاڑ اور دھینگا مشتی میں مصروف ایک صاحبزادے حلقے سے اُٹھے بیچ بچاؤ کرانے کے لئے مگر دو صاحبزادوں نے لپک کر ٹانگ لی اور کہا :-

★ "ابے مزا غارت کر رہا ہے ہمارا کون ہوتا ہے تو "فری اسٹائل" میں دخل دینے والا - ؟"

جواب ملا :-

"تیرا باپ ہوتا ہوں !"

ادھر سے صاحبزادے چمک کر بولے !-

"ابے گدھے کے بچے پہلے اپنی صورت تو دیکھ آئینے میں۔

لیجئے ایک "فری اسٹائل" میں دوسرا "فری اسٹائل" شروع ہو گیا —— یعنی —— ایک ٹکٹ میں دو مزے —— "صاحبزادگان" "بے ٹکٹ" —— "فری اسٹائل" دیکھ رہے ہیں !-

★ "واہ رے میرے بل ورنا"

★ "شاباش میرے اسلم !"

★ "مار دے ٹکر ——— ابے مار دے میں کہتا ہوں!"

★ "توڑ دے ناک کا بانسا"

★ "واہ واہ - کیا قینچی لگائی ہے"

یہ ایک ٹکٹ میں تیسرا مزا بھی شامل ہو گیا یعنی مشاعرے کا مزا ——— ہر وار گویا شعر ہے اور اس پر جی کھول کر داد دی جا رہی ہے - ایک صاحبزادے حائل ہوئے اور تیسرا "فری اسٹائل" شروع ہو گیا - اب کیفیت یہ تھی کہ ہر صاحبزادہ "فری اسٹائل" پر تلا بیٹھا ہے - وہ تو یہ کہیئے کہ کارپوریشن کے ٹاور نے ٹن ٹن کر کے آٹھ بجائے ——— اور ایک صاحبزادے نے کہا ——— وقت ہو گیا ——— اب ہر کوئی بستہ اٹھائے بھاگا جا رہا ہے سیدھا بندر روڈ پر ——— اور بھاگتے میں بھی پیدل چلنے والوں کے ساتھ "فری اسٹائل" ہو رہا ہے۔

★ "دیکھ کر نہیں چلتا بچّہ"

★ "تم دیکھ کر چلو کیا اندھے ہو!"

★ "ابے اندھے کے بچے!"

صاحبزادے آگے آگے بھاگ رہے ہیں اور پیچھے ایک گداگر گالیاں دیتا ہوا بھاگ رہا ہے۔

خیر یہاں تک تو "بچہ لوگ" کے "فری اسٹائل" کا ذکر تھا ان کو "بچہ لوگ" سمجھ کر معاف کیا جا سکتا ہے کیوں کہ یہ عمر ہی ایسی ہے کہ اس میں "فری اسٹائل" چلتا ہے مگر صاحب ہمارے "سٹی فادر لوگ" کو دیکھئے کہ وہ "بچہ لوگ" کی طرح کارپوریشن میں "فری اسٹائل" ہو جاتے ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ کارپوریشن کے خصوصی اجلاس میں ایک "نیشنل ہال" ہٹانے کی تجویز "ماتی لوگ" نے پیش کی اور کہا کہ بیرونی معاملات میں وفاقی دارالحکومت کی اہمیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اس لئے یہاں ایک ایسے ہال کی تعمیر اشد ضروری ہے جہاں عوامی جلسوں، سرکاری کانفرنسوں اور قومی و بین الاقوامی اجتماع کا انتظام کیا جا سکے۔ تجویز کا خیرمقدم کیا گیا مگر اپوزیشن کے "سٹی فادر لوگ" نے کہا۔ کہ اس ہال کا نام "نیشنل" کی بجائے "کراچی سٹی ہال" رکھا جائے اب کیا تھا صاحب۔ اس پر ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے میں "طوفان بدتمیزی اس لئے نہیں کہتا کہ اس میں "بچہ لوگ" نہیں بلکہ "سٹی فادر لوگ" شریک تھے۔ وہ غل غپاڑہ ہوا کہ اپنی اپنی سی ہر کوئی کہہ رہا ہے۔ دوسرے کی نہیں سنتا۔ رائے شماری کرائی گئی تو ہنگامہ اور بڑھا اور فریقین "فری اسٹائل" پر اُتر آئے۔ اسی

گڑبڑ میں !۔

"ایک سٹی فادر کا چشمہ ٹوٹ گیا"
(خدا کا شکر ہے کہ ہڈی پسلی نہیں ٹوٹی)
"ایک سٹی فادر کی قمیص پھٹ گئی"
(خدا کا شکر ہے کہ صرف قمیص ہی پھٹی)

ہاں تو یہ تھا "بچہ لوگ" کے بعد "سٹی فادر لوگ" کا "فری اسٹائل"۔

اب ان "سٹی فادر لوگ" کے "باوا لوگ" کی بھی کیفیت سنئے۔ دستور ساز اسمبلی میں اگرچہ "زبانی فری اسٹائل" چلتا ہے لیکن معاملہ "خالص فری اسٹائل" تک پہنچ کر رک جاتا ہے۔ یہ لوگ آخر بزرگ ہیں۔ اور "باوا لوگ" ہیں وہ صرف چیلنج کرتے ہیں۔ مثلاً عوامی لیگ کے مسٹر ظہیرالدین نے بزرگ سیاستدان ڈاکٹر خان صاحب سے "زبانی فری اسٹائل" ہو کر سب کچھ کہا۔ اس پر ڈاکٹر خان صاحب نے کہا !۔

"ذرا باہر نکل کر دیکھو ——— !"

بہرحال کہنے کا مطلب یہ ہے کہ "فری اسٹائل" جوبن پر ہے یہی وجہ ہے کہ میں بھی "فری اسٹائل" ہو رہا ہوں۔

(۲۵ر فروری ۱۹۵۶ء)

یہ گدھے

"گدھا ــــــ حضرت عیسیٰ کی سواری کا ہو یا غریب کمہار کا۔ گدھا بہرحال گدھا ہے! مار کھانا اور آگے بڑھنا اس کا کام ہے۔ گدھا اگر "ترقی پسند" ہوتا۔ تو علم بغاوت بلند کرتا۔ اور اس کی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی انسان کے کندھوں پر پڑتا۔ اور انسان چپکے سے یہ بوجھ "سائنس" کے کاندھوں پر ڈال دیتا۔ لیکن "سائنس" ــــــ "ترقی پسند" ہے۔ یہ ٹرک منوں بوجھ اٹھاتے ہیں مگر پٹرول نہ ہو تو ایک قدم آگے نہیں بڑھتے۔ گدھا بھوکا پیاسا رہتا ہے۔ اس کے باوجود چلتا جاتا ہے۔ کبھی یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ میری گھاس میں

اضافہ کرو - اگر کسی وقت وہ کسی کے بہکانے سے صدائے احتجاج بلند کرے ـــــ یعنی "ڈھینچوں ـ ڈھینچوں" کے "قومی ترانے" سے سٹرائیک کا آغاز کرے - تو چند لاٹھیاں اسے کام کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں - یہ مار کھاتا اور کام کرتا ہے - کس قدر "وفادار" ہے!

گدھا بیمار ہو یا زخمی ـــــ تھکا ہارا ہو بوجھ تلے دبا ہوا۔ جب تک اس میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی سکت اور آپ کے ہاتھ میں لاٹھی ہے آپ اسے ہنکائے لئے چلے جائیے۔ وہ ایک لفظ بھی آپ کے خلاف نہیں کہے گا - بڑھتا چلا جائے گا - اور مزے میں آئے گا تو گائے گا۔

ع رکنا میرا کام نہیں بڑھنا میری شان

امریکہ کا گدھا ہو یا روس کا - انگلستان کا گدھا ہو یا ہندوستان کا - افریقہ کا ہو یا حجاز کا - ایران کا ہو یا خراسان کا یا پاکستان کا وہ کہیں کا ہو - یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ وہ گدھا ہے - گدھوں میں رنگ یا نسل کا کوئی فرق نہیں - ان میں گورے کالے کی کوئی تمیز نہیں - سب گدھے بھائی بھائی ہیں!

دنیا کی تاریخ میں بڑے بڑے انقلاب آئے لیکن گدھے

کی فطرت میں کوئی انقلاب نہیں آیا۔ وہ اس وقت بھی گدھا تھا جب حضرت آدمؑ کو جنت سے نکالا گیا۔ اور وہ آج بھی گدھا ہے۔

یوں تو ہر جگہ گدھوں نے بڑے بڑے کام کئے ہیں۔ لیکن کراچی کی تعمیر ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ یہ بڑی بڑی عمارتیں۔ یہ لمبی لمبی سڑکیں پہلے کہاں تھیں؟ ماہی گیروں کی چھوٹی سی بستی بڑھتے بڑھتے، پھیلتے پھیلتے بہت بڑا شہر بن گئی۔ گدھے باہر سے ریت لاتے رہے۔ سیمنٹ، بجری، چونا اور اینٹ گارا پہنچاتے رہے۔ اور دیکھتے دیکھتے یہ شہر دنیا کا بڑا شہر بن گیا۔ پہاڑوں کے تنگ اور پُرپیچ راستے، جہاں کوئی ٹرک نہیں جا سکتا وہاں گدھا ہی پہنچ سکتا ہے گدھے کے ساتھ گاڑی کے اضافہ نے تو سونے پر سہاگہ کا کام کیا اس طرح ایک گدھا چار چار گدھوں کا بوجھ اٹھانے لگا اور وہ کام جو گاڑی کے بغیر پورے ڈیڑھ سو برس میں ختم ہوتا پچاس برس میں ختم ہو گیا۔ قوموں کی زندگی میں پچاس برس ایک لمحہ کے برابر ہیں۔ یوں سمجھئے کہ پلک جھپکتے میں یہ سب کچھ ہو گیا جو وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا۔

"سائنس" بھی اتنا بڑا کمال نہیں کر سکتی۔ جو اس "گدھا

گاڑی" نے کیا۔ جسے آپ کراچی میں ہر موڑ پر دیکھ سکتے ہیں۔ یہ "گدھا گاڑی" آپ کو کسی اور شہر میں نہیں مل سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان شہروں نے بڑی دیر میں ترقی کی۔ کیونکہ وہاں گدھے بغیر گاڑی کے بوجھ اُٹھاتے ہیں پنجاب میں تو بیل گاڑیوں سے زیادہ کام لیا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ وہاں ترقی کی رفتار بہت سست رہی۔ لاہور کی تعمیر مغلوں کے زمانہ سے شروع ہوئی۔ اور آج تک ختم ہونے میں نہیں آئی۔ وہاں کے لوگ "ڈھگوں" پر بھروسہ کرتے رہے۔ اگر وہ بھی گدھا گاڑیاں بناتے تو اتنے طویل عرصہ میں وہ لاہور کو "نیویارک" بنا سکتے تھے

دنیا کے کسی ترقی یافتہ ملک میں آپ کو "گدھا گاڑیاں" نظر نہ آئیں گی۔ گدھے نے تاریخ میں اگر کوئی ترقی کی ہے تو وہ یہی ہے کہ کراچی والوں نے اسے گاڑیوں میں استعمال کیا اور ایک گدھے نے چار گدھوں کا بوجھ اٹھایا۔ ایک آدمی جس کام کو پچاس دن میں کرتا ہے۔ چار آدمی یقیناً اسے کم دنوں میں کریں گے۔ یہ "چوتھی جماعت" کے "حساب" مولفہ خواجہ المتخلص بہ "روڈ" کا ایک سادہ سا "سوال" ہے لیکن ایک گدھے نے گاڑی کی مدد سے وہ کام کیا جسے شاید چار گدھے مل کر بھی نہ کر سکتے۔

گھوڑے اس سے پہلے بہت ہی مغرور تھے۔ انہیں گھمنڈ تھا کہ وہ بلا شرکت غیرے ایک گاڑی کے مالک ہیں - یہی وجہ ہے کہ وہ بڑی بے راہ روی سے سڑکوں پر چلتے تھے۔ اور گدھے کو دیکھ کر فخر سے سر اونچا کر لیتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ کوئی "راہ گیر" (آج کی ماڈرن اصطلاح میں "پناہ گیر") گاڑی کے نیچے آ جاتا تھا۔

لیکن گدھے میں نام کو غرور نہیں۔ وہ اس وقت بھی گدھا تھا جب گاڑی کا "دم چھلا" اس کے ساتھ نہیں لگا تھا اور آج بھی ویسا ہی گدھا ہے۔ پس ـــــ ثابت ہوا کہ وہ "بڑا آدمی" ہو کر "بددماغ" نہیں ہوا - ورنہ وہ بھی گھوڑے کی طرح گمراہ ہو جاتا۔ اور آئے دن تصادم ہوتے رہتے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آج تک کوئی شخص گدھا گاڑی کے نیچے آ کر نہیں مرا۔ اس کی وجہ گدھے کی "سلامت روی" ہے۔

کار جب سڑک پر سے گذرتی ہے تو پیدل چلنے والوں پر بڑی بدتمیزی سے خاک دھول اڑاتی ہے۔ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی اور سمجھتی ہے کہ یہ سب میرے سامنے گرد ہیں۔ لیکن "گدھا گاڑی" نے کبھی ایسی بدتمیزی کا مظاہرہ نہیں کیا - وہ انسان کو ہمیشہ انسان سمجھتی ہے - آپ ایک مثال پیش نہیں کر سکتے - جب "گدھا گاڑی" نے کبھی سڑک پر خاک اڑائی ہو۔ ٹرام کا انجن فیل ہو جائے تو

وہ کراچی کی زبان میں "کھٹارا" ہے۔ کار کا پٹرول ختم ہو جائے۔ تو وہ "بے کار" ہے۔ ریل کے انجن کا کوئلہ ختم ہو جائے تو وہ "گدھا گاڑی" سے بھی زیادہ ذلیل سواری ہے یہ "گدھا گاڑی" ہے جو ہر حالت میں چلتی ہے۔ سچ کہتے ہیں :۔

"چلتی کا نام گاڑی ہے ——!"

گدھا گاڑی میں عموماً دو گدھے ہوتے ہیں۔ ایک تو اصلی گدھا ہوتا ہے جو گاڑی کھینچتا ہے۔ اور دوسرا "محض گدھا" ہوتا ہے۔ یہ اصلی گدھے کے ساتھ دوڑتا ہے۔ پہلے تو ہم سمجھے کہ گاڑی میں ایک گدھا کافی ہے۔ دوسرے کی تو یار لوگ یوں ہی "پخ" لگاتے ہیں۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ دوسرا گدھا "تربیت" اور تعلیم کے لئے گاڑی سے بندھا رہتا ہے۔ تین سال تک یہ تعلیم حاصل کرتا ہے اور پھر اعلیٰ تعلیمی ڈگری لے کر اپنی گاڑی آپ چلاتا ہے۔ اور ایک "نئے شاگرد پیشہ" کی تعلیم و تربیت میں منہمک ہو جاتا ہے۔

میں سوچتا ہوں اگر ایک پڑھا لکھا شخص ایک ایک جاہل کو اسی طرح پڑھاتا تو آج ہمارے ملک میں تعلیم عام ہو جاتی۔ اور لوگ بجائے انگوٹھا لگانے کے "راشن کارڈ کی درخواست" پر دستخط کرتے۔ بہرحال پہلے سال گدھا نمبر ۲ محض گدھا رہتا

ہے۔ دوسرے سال وہ پچاس فیصدی گدھا بن جاتا ہے۔ یعنی اگر کسی موڑ پر دائیں یا بائیں مڑنا ہو تو وہ "ہینڈل" کا کام دیتا ہے۔ اور کبھی کبھی وہ "بریک" کی جگہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ دو سال میں وہ "بی اے" یعنی (BIG-ASS) بن جاتا ہے۔ پھر وہ "ایم اے" پاس کرتا ہے —— اور کبھی کبھی اصل گدھے کی جگہ لیتا ہے۔ اس کے بعد وہ گدھا نمبرا۔ یعنی مکمل گدھا بن جاتا ہے۔ اور زندگی کی دوڑ میں حصّہ لیتا ہے۔ کام کرتا ہے۔ مار کھاتا ہے مگر بڑھتا چلا جاتا ہے۔ جب تک موت کی منزل نہیں آتی۔

ہندوستان اور پاکستان آزاد ہو گئے۔ لیکن گدھے ابھی تک غلام ہیں۔ وہ ہمیشہ غلام رہیں گے ——!

"جشن آزادی" کے بعد بھی یہ گدھے اسی طرح بوجھ اٹھاتے ہیں جس طرح کل اٹھائے پھرتے تھے ——!

یہ گدھے جو کل بھی گدھے تھے اور آج بھی گدھے ہیں۔ کہتے ہیں۔ کہ ہم اس وقت بیدار ہوں گے جب "دجال" گدھے پر سوار ہو کر آئے گا۔ یہ گدھے۔ کسی کے منتظر ہیں لیکن بیدار ہو کر یہ گدھے نہیں رہیں گے۔ بلکہ انسان بن جائیں گے۔!

موسم کی بات

کراچی کا موسم اور معشوق کا مزاج ۔ دونوں ملتی جلتی چیزیں ہیں ۔ ع

کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے ابھی کیا تھا ابھی کیا ہے

یہاں گرمی میں سردی اور سردی میں گرمی پڑتی ہے اور کبھی کبھی تو ایک موسم میں بارہ مسالے کی چاٹ کی طرح سبھی موسم چلتے ہیں ابھی پچھلے دنوں خنک ہوائیں چل رہی تھیں ۔ بوندا باندی ہو رہی تھی ۔ لوگ سر۔ کان لپیٹ کر شال اور کمبل اوڑھ کر چل رہے تھے ۔ دودھ سے دن میں کچھ گرمی محسوس ہونے لگی ۔ ابھی کل کی بات ہے کہ ہم نے موسم کو خوشگوار بنانے کے لئے پنکھا

چھوڑ دیا۔ کیا "دیوانہ گر" موسم بن گیا۔ کچھ نہ پوچھئے۔ یہ تو خیر قدرتی موسموں کا تذکرہ ہے ان موسموں کے علاوہ کراچی میں سماجی اور تہذیبی موسم بھی چلتے ہیں۔ کبھی نمائش کا موسم۔ کبھی کرکٹ کا موسم —— کبھی مینا بازار کا موسم۔ کبھی اپوا کا موسم۔ کبھی جماعت اسلامی کبھی فری اسٹائل کشتی کا موسم۔ کبھی جلسوں کا موسم۔ کبھی زندہ باد کا موسم۔ کبھی مردہ باد کا موسم اور کبھی مشاعرے کا موسم۔ یہ موسم کبھی تو یکے بعد دیگرے آتے ہیں اور کبھی ایک ساتھ چلتے ہیں۔ ان کا معاملہ بھی وہی قدرتی موسموں کا سا ہے یعنی معشوق کے مزاج کی طرح کبھی کچھ کبھی کچھ۔!

ابھی کل تک تو کرکٹ کا موسم چل رہا تھا اور ساتھ ہی کچھ فٹ بال کے چھینٹے بھی پڑے تھے مگر آج کل دو موسم —— ایک ٹکٹ میں دو مزے کی طرح چل رہے ہیں —— ایک تو "ون یونٹ" اسمبلی الیکشن" کا موسم ہے یہ موسم عام نہیں خاص ہے یعنی انتخابات عام نہیں ہیں بلکہ "سٹی فادران" ہی "معزز ووٹران" بنے ہوئے ہیں —— اور کارپوریشن آج کل "کار پریشان" بن گئی ہے۔ خیر "سٹی فادر لوگ" کے موسم سے ہمیں کیا تعلق —— ہم تو سٹی کے "بچہ لوگ" کے موسم کا ذکر کرتے ہیں۔ یہاں آج کل مشاعرے کا موسم چل رہا ہے کسی

کسی دور میں یہ موسم بڑی دھوم دھام سے آتا تھا ۔ ایک پاک ہند مشاعرے سے اس کی ابتدا ہوتی تھی ۔ اس مشاعرے کے بعد لوگ دیپ سے دیپ جلاتے تھے اور شہر کے ہر کونے کھانچے میں مشاعرہ کر ڈالتے تھے تاکہ تمام محلے والے بجائے سونے کے رات بھر جاگتے رہیں اور جاسوسی ناولوں کی طرح راتوں کی نیند حرام ہو جائے ۔ یہ قوم کی بیداری کا عظیم الشان مظاہرہ تھا مگر محلے والے پولیس میں رپٹ لکھواتے تھے کہ کمبختوں نے رات بھر سونے نہیں دیا ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رقیب تھانے میں جا جا کر رپٹ لکھواتے تھے ؎

کہ اکبرؔ نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

غرضیکہ بڑے مشاعرے کی "آل اولاد" پورے شہر میں پوری "شہری آزادی" کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلتی تھی اور مشاعرے کا موسم پورے جوبن پر ہوتا تھا ۔ یہی نہیں کہ مشاعرے کا موسم پاکستان ہی میں آتا تھا بلکہ بھارت میں بھی اس مشاعرے کی ابتدا ایک بڑے مشاعرے سے ہوتی تھی فرق صرف اتنا تھا کہ وہاں پاکستان سے کچھ شاعر جاتے تھے اور اس مشاعرے کو !

"ہند و پاک مشاعرہ"

کہا جاتا تھا ۔ جب بھارت کے شاعر پاکستان آتے تھے

تو یہاں یہ مشاعرہ ! -

"پاک و ہند مشاعرہ"

بن جاتا - ہاں تو ذکر ہو رہا تھا کہ آج کل بھی مشاعرے کا موسم ہے لیکن یار لوگوں نے گوری کا جوبن چٹکیوں میں اڑا لیا ہے اب کی نہ وہ دھوم دھام ہے نہ وہ گہما گہمی - بھارت سے چند شاعر آئے جن میں ایک آدھ ہی قابل ذکر ہے - یہ مشاعرہ ہوا کچھ اس انداز سے جیسے قبرستان میں ہوا - نہ کوئی خبر نہ تصویریں نہ دھوم دھام —— کچھ نام دئیے گئے اور آخر میں لکھا گیا "دیگر مقامی شعراء" —— گویا مقامی ہونا ہی ان کا گناہ تھا یہی نہیں بلکہ لونڈوں کے ہاتھ شاعروں کو "پرچہ" بھیج دیا گیا کہ وہ یہ "سمن" وصول کر کے "عدالت" میں حاضر ہو جائیں گے - جب مقامی شعراء کو "و دیگر مقامی شعراء" بنا دیا گیا تو انہوں نے بھی کہہ دیا کہ ؂

من دیگرم تو دیگری

یہی نہیں بلکہ بعض بڑے شاعروں نے بھی مشاعرے کا "بائیکاٹ" کر دیا انتظام کرنے والوں کے "بھائی پاٹ" کی کاٹ گویا "بائی کاٹ" سے کی گئی - مختصر یہ کہ اب کی مشاعرے کا موسم یوں آیا جیسے برسات میں ایک لمحے کے لئے دھوپ نکل آتی ہے

(۱۸ر جنوری ۱۹۵۶ء)

"راجہ بھوج کے دربار میں"

"راجہ بھوج" نے اپنے منتریوں کو بلایا اور پوچھا !۔
"میں نے سُنا ہے کہ میرے دیش میں عوام بھی ہیں ـــــ؟"
ایک منتری بولا !۔
" ادھیراج مہاراج ! یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ
اس ملک میں عوام بھی ہیں ؟" دوسرا منتری بولا۔
"یہ بات بالکل جھوٹ ہے مہاراج ! کسی نے یوں
ہی آپ کو پریشان کرنے کے لئے کہہ دیا ہوگا کہ ہمارے
دیش میں عوام بھی ہیں ـــــ"
تیسرا منتری بولا !۔

"مہاراج کا راج جُگ جُگ قائم رہے - اور مہاراج کے راج سنگھاسن کو پرماتما وشٹوں کی نظر بد سے بچائے اور ہمارے دیش میں اگر عوام ہیں بھی تو وہ نہ ہونے کے برابر ہیں - مہاراج کے ایک اشارے پر گردنیں جھکاتے ہیں - وہ مہاراج کے سیوک ہیں داسی ہیں -"

دوسرا منتری بولا ! ———

"مہاراج ہم نے تو اس دیش میں عوام نہیں دیکھے"

راجہ بھوج نے تیسرے منتری سے کہا ! ———

"کیا تم نے کہیں عوام دیکھے ہیں ؟"

تیسرا منتری بولا !

"بالکل نہیں مہاراج -"

مہاراج نے کہا ! ———

"اور تم نے ——— ؟"

دوسرا منتری بولا ! ———

"بالکل نہیں مہاراج"

مہاراج نے پہلے منتری سے پوچھا تو اس نے کہا ! ———

"مہاراج دھوبی گھاٹ پر میں نے چند آدمیوں کو دیکھا تھا - ایک شخص نے کہا تھا کہ یہ عوام ہیں - لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ عوام نہیں - بلکہ دھوبی تھے -"

تیسرے منتری نے کہا !

" مہاراج ! آپ کو یاد ہوگا۔ آنند بھون کے باہر چند وشٹوں نے بھاشن دیا اور کہا کہ جنتا بھوکوں مر رہی ہے ان کے پاس نہ سر چھپانے کو جگہ ہے نہ پہننے کو کپڑا ہے۔ جب وہ بیمار پڑتے ہیں تو ان کے لئے دوا کا انتظام نہیں۔ اسی وقت مہامنتری نے یہ حکم دیا تھا کہ ان وشٹوں کا سر کچل دو۔ جو مہاراج کے راج میں ایسی باتیں کہتے ہیں۔ جنتا تو سکھی ہے۔ اگر اسے تکلیف ہے تو وہ خود کیوں نہیں کہتی۔ یہ لوگ کون ہیں جو ان کے وکیل بن گئے ہیں۔ اسی وقت سینا کے جوانوں نے لاٹھیاں آنند بھون کے باہر گھمائیں تو وہ لوگ جو جمع تھے سب بھاگ گئے۔ اور وہاں صرف دھوتیاں۔ پگڑیاں۔ جوتے۔ چھڑیاں۔ مونگ پھلی کے چھلکے رہ گئے انہی چیزوں کا نام عوام ہے مہاراج۔"

پہلا منتری بولا !

"مہاراج کے چار رکھشک لاٹھیوں سے پچاس ہزار عوام کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکا کر لے جا سکتے ہیں۔"

مہاراج نے کہا ! ——

"اب مجھے پورا وشواش ہو گیا ہے کہ میرے دیش میں عوام نہیں ہیں۔"

پہلا منتری بولا !——

"بالکل نہیں مہاراج"

دوسرا منتری بولا !——

"اس کام کی کوئی چیز نہیں ہے ہمارے دیش میں مہاراج !"

تیسرا منتری بولا !

"اگر عوام ہیں بھی تو نہیں کے برابر ہیں مہاراج"

راجہ بھوج کو نیند آ گئی——راجہ بھوج کے دربار میں یہ صدائیں گونج رہی تھیں۔

"اس دیش میں عوام نہیں ہیں"

"اگر ہیں بھی تو بھی نہیں ہیں"

"عوام شاید ہمیں دیکھتے ہوں مگر ہم نے انہیں کبھی نہیں دیکھا"

"عوام پگڑیوں، دھوتیوں اور جوتوں کا نام ہے"

"جو عوام کا نام لیتے ہیں وہ عوام کو دھوکہ دیتے ہیں"

"عوام خود نہیں بولتے ان کی جگہ دشٹ بولتے ہیں"

راجہ بھوج جاگے اور حکم دیا کہ "منتریوں کو انعام و اکرام سے نوازا جائے——!"

(۱۹۴۹ء)

"عورتوں کی تین قسمیں"!

ہمارے ہاں عورتوں کی تین قسمیں ہیں ــــ ایک تو "انتہا پسند"۔ یہ وہ ہیں جو کھلے بندوں دعوت نظارگی دیتی ہیں۔ اور کہتی ہیں کہ۔ ــــ اے آدم کے بیٹو! تم سمجھتے ہو کہ بس ہمیں "ترقی پسند" ہیں ــــ ادھر دیکھو حوا کی بیٹیاں بھی پر لگا کر آسمان کی بلندیوں کی طرف اڑیں گی۔ اور اس جہاں میں پہنچکر دم لیں گی جو ــــ ستاروں سے آگے ہے۔

یہ بناؤ چناؤ ــــ یہ غازہ ــــ یہ لپ اسٹک ــــ یہ زلفیں یہ عارض کے گلاب ــــ یہ خوشبو ــــ یہ مہک ــــ یہ قیامت! ہم نے تمہیں جنّت سے نکال دیا تھا۔ تم نے یہاں آکر جنّت

بنا لی - تمہاری جنت ، تمہارے تصورات ، ہماری رنگینی کی تاب نہیں لا سکتے ——— بہرحال یہ "ترقی پسند" عورتیں فخر کے ساتھ تمام قیود ، تمام حدود اور حجاب کی تمام دیواریں پھاند کر بڑھتی چلی جاتی ہیں ——— "انتہا پسند" عورتیں یہ کہتی ہیں اگر اس آزادی کے دور میں تم نے ہماری آزادی کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی تو ہم اس کے خلاف اپنے حسین آنچل کے پرچم تلے آزادی کی لڑائی لڑیں گی - ہمارا قافلہ اب زندگی کی ان منزلوں میں ہے جہاں تہذیب کے ارتقائی محل ہیں - جہاں تاریکیاں نہیں روشنی ہے - روشنی کے مینار ہیں - !

عورتوں کی دوسری قسم "رجعت پسند" ہے ——— پرانے گوٹوں کی سربمہر گٹھڑیاں ——— چلتے پھرتے خیمے - کیا مجال کہ ہوا بھی آزادی کے ساتھ برقع میں داخل ہو سکے ——— کیا مجال کہ فرشتہ بھی چاردیواری میں پر مار سکے - چکی چولہے کی کائنات گھر کا گھٹا گھٹا سا ماحول "قیدِ تنہائی" ——— بھرے پرے گھر میں یہ تنہا نظر آتی ہیں - اپنے ڈھب کی عورتوں سے ملتی ہیں - !

پیروں کی نیازیں - گیارھویں کی منتیں - ٹونے ٹوٹکے - تعویذ گنڈے - بھوت پریت - ہنڈیا میں نمک زیادہ پڑ گیا - قیامت ! ——— رحیمن نے ریشمی کپڑے پہن رکھے ہیں اور اس پر زیور ———

اب اس اللہ کی بندی سے کوئی پوچھے اس عمر میں یہ سولہ سنگار ——یہ بہوؤں کی ریس کرتی ہے۔

بندو اپنی بیوی کے لئے زری کا جوتا لایا۔ گھر میں جوتا چل گیا!

"میرے لئے بھی لائے ہوتے تمہارے باپ کا راج تھا۔ تو میں گھر کی رانی تھی اب میں نگوڑی گھر کی لونڈی ہو گئی۔"

یہ ہیں "رجعت پسند" عورتیں —— یہ ہے چکی چولھے کا ماحول!

عورتوں کی تیسری قسم "اعتدال پسند" ہے۔ یہ قیدی بھی ہے آزاد بھی۔ اس سرو کی طرح جو آزاد ہوتے ہوئے پاگل ہے۔ یہ بےنقاب بھی ہیں اور "باپردہ" بھی۔ کپڑا خرید رہی ہیں، دکاندار سے باتیں کرتی ہیں، آنچل کا گرا ہوا پلّو اٹھاتی ہیں ادھر اڑوس پڑوس کا کوئی آدمی گذرا یا کوئی جانی پہچانی عورت دیکھی یا کوئی عزیز نظر آیا جھٹ چہرے کے دروازے پر چلمن ڈال دی۔ یہ بت جھانک کر چلمن ڈالتے ہیں۔ ان کا شیوہ یہ ہے کہ ایک نظر دیکھا اور چلمن ڈال دی۔

ایک بجلی سی فضا میں لہرائی —— ایک کوندا لپکا —— ایک جھونکا آیا —— اور گزر گیا۔ چاند جلوہ دکھا کر "کالے

کالے" بادلوں میں چھپ گیا۔ یہ ہیں "اعتدال پسند" عورتیں۔

ہم مولوی ہیں نہ ملّا —— جو فتویٰ دیں کہ ان میں کونسا طبقہ "برحق" ہے ہماری رائے میں نہ "انتہا پسند" اچھی ہیں نہ "رجعت پسند"۔ اور یہ "اعتدال پسند" تو بڑی حد تک خطرناک قسم کی ہیں! —— ہم عورت کو نہ سمجھ سکے۔ ہم نے یا تو اسے بالکل "شمع محفل" بنا دیا۔ یا بالکل "چراغ خانہ" یا اس کے بیچوں بیچ جھونکوں کی زد میں آیا ہوا چراغ۔

عورت ماں بھی ہے، بہن بھی ہے، بیٹی بھی ہے۔ اور عورت بیوی بھی ہے اب یہ فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے کہ ماں ہو تو کیسی —— ؟ بہن ہو تو کس قسم کی —— ؟ بیٹی ہو تو کیسی ؟ اور بیوی ہو تو کس طرح کی —— ؟

فیصلہ کیجئے —— آپ کی تاریخ میں مائیں بھی ہیں —— اور بہنیں بھی —— بیٹیاں بھی ہیں اور بیویاں بھی —— لیکن آپ کہہ دیں گے تاریخ ہمارا "سبجکٹ" نہیں۔ ہمارا مضمون حساب ہے —— لیکن یہ کہئے کہ —— "یوم الحساب" پر بھی آپ کا ایمان ہے —— ؟

(۲۸ر مارچ سنہ ۱۹۵۶ء)

"کچھ ناموں کے متعلق"

ایک صاحب کا نام تھا گلزار علی ـــــ ان کے لڑکے کا نام تھا گل از گلزار علی ! اب جو گل از گلزار علی کو اللہ تعالیٰ نے فرزند ارجمند عطا فرمایا تو اس کا نام انہوں نے رکھا ۔
"غنچہ کہ دمیدہ در گلزار علی"

مشرقی بنگال کے ایک گاؤں میں ایک مولوی صاحب تھے جن سے لوگ نام رکھواتے تھے ان کے پاس "طلسم ہوشربا" کی جلدیں تھیں ـــــ جن میں سے وہ عموماً نام رکھتے تھے ـــــ بدیع الزماں ـــــ امیر حمزہ ـــــ صاحب قرآن ـــــ نورالدہر ایرج ملکہ

حیرت ـــــ ملکۂ صبا ـــــ عمر عیار ـــــ مظہر العجائب ـــــ سحر الغرائب وغیرہ

مشرقی بنگال میں چونکہ لوگ بہت ہی دیندار قسم کے ہیں لہذا ان کے نام میں "دین کا ڈنکا" ضرور بجتا ہے۔ شہاب الدین ظہیر الدین ۔ تمیز الدین ۔ امین الدین ۔ فہیم الدین ۔ اور اس قسم کے بہت سے نام ہم سنتے ہیں ۔ لیکن وہاں ایک صاحب کا نام تھا "خدا الدین" ـــــ اسی سرسبز شاداب خطہ میں تاڑ کے درخت بھی ہیں اور کھجوروں کے بھی ۔ چنانچہ ایک صاحب کا نام "تاڑ محمد" اور ایک خاتون کا نام تھا "کھجور النساء"

ایک اور دلچسپ نام سنئے ۔ ایک خاتون کا نام "پائے پیڑھی بی بی فاطمہ" اور اس سے زیادہ دلچسپ نام یہ ہے کہ بڑے بھائی کا نام "فروغ" چھوٹے بھائی کا نام قافئے کی رعایت سے "دروغ" رکھا گیا ۔ (دروغ برگردن راوی)

فتح پور الہ آباد کے پاس ضلع ہے ـــــ "نگار" لکھنؤ کے ایڈیٹر حضرت نیاز بھی وہیں کے رہنے والے ہیں ۔ ہاں تو یہاں تھے ایک صاحب خان صاحب سید طفیل ان کے لڑکوں کے نام یوں تھے سہیل ۔ فضیل ۔ بلبل ۔ جمبل ۔ کمبل ۔ کفیل ۔ ایک صاحب نے تجویز کیا کہ نئے بچے کا نام "غلیل" رکھدو ۔

خیر اس پر ایک فرمائشی قہقہہ بلند ہوا۔ ایک صاحب نے دریافت کیا کہ آپ نے لڑکیوں کے نام میں قافیہ آرائی کیوں نہیں کی؟ طفیل صاحب نے کہا اس میں تو قافیہ کوئی نہیں تھا ایک اور صاحب کہنے لگے قافیہ کیوں نہیں تھا آپ "چڑیل" نام رکھ سکتے تھے۔

علی گڑھ میں ایک لنکا کا رہنے والا لڑکا پڑھتا تھا۔
"مینا منکا چمن بے سلیماں بدیع الدین محمد عمر نور محمد معین الدین"
آپ سمجھے ہوں گے کہ یہ پورا شجرہ نسب ہے لیکن صاحب یہ ایک نام ہے۔ ہاں تو یہ صاحبزادے الہ آباد یونیورسٹی کے ایک مباحثہ کے سلسلہ میں آئے اور مسلم ہوٹل میں ٹھہرے وہاں کے لڑکوں نے اس کا نام کچھ "شارٹ ہینڈ" بنا لیا — ایم این ایم سلیمان —! اور روزانہ صبح ان کے کمرے کے سامنے ان کے پورے نام کا کورس گایا کرتے تھے۔

برما کے ایک وزیر (جنگ سے قبل) کا نام تھا
"پوتھاراوری مونگ ساؤ پوتھان"۔ یہ "پوتھان" یوں معلوم ہوتا ہے جیسے "پٹھان" سے مستعار لیا گیا ہے۔ یہ نام پڑھ کر ہمیں ایک دلچسپ بات سوجھی تھی وہ یہ کہ اگر

غلام نبی پٹھان اور یوسف ہارون ایک ساتھ آ رہے ہوں تو ان کا مشترکہ نام ہونا چاہیئے ۔ "یوتھن جوزف"

آج سے تقریباً بیس سال پہلے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخلہ کے لئے ہمارے ایک سندھی بھائی نے درخواست دی ۔ ان کا اسم گرامی تھا "سلنگی فتح محمد خان سمانوں خاں"۔ جب یہ درخواست پرووائس چانسلر صاحب کے سامنے پیش ہوئی تو کسی نے کہا کہ صاحب ! یہ تو اچھا خاصہ مصرعہ ہے اور دیکھتے میں لے سے پڑھتا ہوں

اس کے دوسرے دن ایک درخواست اور آئی اور جن صاحب نے پرووائس چانسلر صاحب کے سامنے پہلے نام کا مصرعہ بتایا تھا وہ دوڑے ہوئے آئے اور کہنے لگے حضرت آج شعر پورا ہو گیا یعنی ایک نام ایسا ہی اور آگیا ہے دیکھیئے میں دونوں ناموں کو ملا کر پورا شعر پڑھتا ہوں ملاحظہ ہو ؎

سلنگی فتح محمد خاں سمانوں خاں
سگھاڑی غلام علی دودوں خان

اوّل الذکر اسم گرامی کے مالک اب بھی کراچی میں ہیں جب ملتے ہیں تو فوراً یہ شعر یاد آ جاتا ہے ۔

خدا نہ کرے کہیں ان سطور پر ان کی نظر پڑ جائے

چند اور بھی پُرلطف نام کل ہی میرے ایک دوست جو ڈاکٹر ہیں سُنا رہے تھے کہ ان کے ہسپتال میں ایک مریضہ آئی۔ اس کا نام جو دریافت کیا تو کہنے لگی "گرناز" پہلے تو یہ نام سمجھ میں نہ آ سکا پھر ذرا غور کیا تو معلوم ہوا کہ نام ہے "گرہ ناز" ذرا نام کی اس شاعرانہ لطافت کی داد دیجئے۔ اور اس کے ساتھ پھر یہ نام سنئے۔ "امید بھری" اس سے زیادہ پُرحقیقت نام اور کیا ہوگا اچھا تو ایک نام اور سنئے اور پھر رخصت یعنی نام ہے۔ "اللہ بچایا" - جب "اللہ بخش" اور "اللہ رکھا" نام رکھ سکتے ہیں تو "اللہ بچایا" میں کیا ہرج ہے ؟

سمجھ اپنی اپنی پسند اپنی اپنی

دہلی میں ایک سندھی ایس ڈی او تھے جن کا اسم گرامی تھا "محمد اپریل"۔ انہیں دیکھ کر ہمیشہ دل میں ایک گدگدی پیدا ہوتی تھی کہ ابھی ماہواری قسم کے ناموں میں گیارہ کی اور گنجائش ہے۔

حیدر آباد میں محمد بجل بلکہ محمد بجل علی بہت سے نام ہیں۔ بعض تو ان میں سے بی اے ایل ایل بی اور گزیٹیڈ آفیسر بھی ہیں۔ واقعی یہ بجل بہت چلتا ہوا نام ہے۔

سکھ بہت ہی دلچسپ قوم ہے اور پھر اس کے نام وہ تو اور بھی دلچسپ ہیں۔ دنیا میں یہی ایک قوم ہے جس

کو نام تلاش کرنے میں قطعاً دقت نہیں ہوتی۔ کوئی سی چیز ہو اس کے ساتھ صرف "سنگھ" لگا دیجئے۔ بس نام بن جائے گا مثلاً "گدھا سنگھ" یوں معلوم ہوتا ہے جیسے گدھے کے سر پر سینگ ہیں "کیکر سنگھ" "ببول سنگھ" "دروازہ سنگھ" "کہاڑا سنگھ" (کلہاڑا)

دہلی میں ایک سردار جی تھے ان کے دروازے پر ایک چھوٹا سا بورڈ تھا۔ نہایت ہی خطرناک قسم کا۔ خطرناک قسم کا اس لئے کہ اس پر لکھا تھا۔

"سردار سر توڑ سنگھ"

یہ بورڈ آنے جانے والوں کو سردار جی کے خوفناک نام سے آگاہی بخشا کرتا تھا۔

جھانسی میں ایک بزرگ رہتے تھے جن کا نام تھا عبدالغنی لیکن انہوں نے پیدائشی شاعری شروع کر دی۔ یعنی بچوں کے نام "ہم قافیہ" رکھنا شروع کئے ان کے لڑکوں کے نام تھے عبدالشافی عبدالوافی۔ عبدالکافی۔ جب چوتھا لڑکا پیدا ہوا تو کسی دوست نے مشورہ دیا اس کا نام عبدالثانی (مٹھائی) رکھ دو نام پکارتے وقت منہ میٹھا ہو جائے گا۔

وہ تو کہئے کہ جھانسی میں حکیم سعید صاحب کا ہمدرد

دواخانہ نہیں تھا ورنہ وہ صاحب لڑکے کا نام "عبدالصافی" رکھ دیتے۔

(۳۱ مارچ ۵۶ء)

دس نمبر سے چار سو بیس تک

انگریز کے دور میں یوں بھی ہوتا تھا کہ بعض سیاسی کارکنوں کے خلاف ـــــ حکومت ـــــ ڈیفنس آف انڈیا ـــــ اندیشۂ نقص امن ـــــ اور اسی قسم کے دوسرے قانونی حربے استعمال نہیں کرتی تھی بلکہ انہیں بعض اخلاقی جرائم میں دھر لیا جاتا تھا ـــــ بیشتر یوں بھی ہوتا تھا کہ اچھے خاصے شریف آدمی کا نام دس نمبر میں درج ہو جاتا تھا اسے نظر بند کرنے کے بجائے "پابند مسکن" کر دیا جاتا تھا۔ یہ محض اس لئے کہ لوگوں کو اس سے ہمدردی نہ رہے اور وہ حکومت کے اقدام کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہ کر سکیں۔ نفسیاتی طور پر اس شخص کے ساتھ کسی کو ہمدردی

نہیں ہوتی جس کا نام دس نمبر میں درج ہو۔

اگرچہ ہمارے نزدیک اس قسم کی لیڈری جس میں لیڈر کی زندگی کا تمامتر دارومدار قوم کے چندوں پر ہو۔ کھلی ہوئی بدمعاشی ہے کیوں کہ لیڈر بجائے اس حلال کے چندے بازی کو ذریعہ معاش بناتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ "بدمعاشی" ہے لیکن مولوی گلشیر خاں کہتے ہیں کہ یہ ایسی بدمعاشی بھی نہیں جس کی بنا پر کسی شریف آدمی کا نام دس نمبر میں درج ہو جائے بہرحال حکومت کی بدمعاشی یہی تھی۔ کہ وہ سیاسی کارکنوں کو دس نمبری قرار دیکر عوام کی نگاہوں میں گرا دیتی تھی۔

صرف یہی نہیں کہ سیاسی کارکنوں کے ساتھ ہی ایسا ہوتا تھا بلکہ بعض اوقات ڈپٹی کمشنر سے کسی شریف آدمی کی ٹھن جاتی تھی تو اسے بھی دس نمبر "بستہ الف ــــ یا بستہ ب" میں جگہ ملتی تھی۔

پنجاب کے ایک ضلع میں ایک چودھری صاحب کو جو بڑے زمیندار تھے۔ ڈپٹی کمشنر سے مخاصمت کی بنا پر دس نمبر میں شامل کر دیا گیا تھا ــــ اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ چودھری صاحب کونسل آف اسٹیٹ کے ممبر بھی تھے۔ اس

ممبری کی وجہ سے اگرچہ وہ اپنے نام سے پہلے آنریبل لکھتے تھے۔ آنریبل یعنی ـــــ عزت مآب ـــــ لیکن تھے وہ ـــــ دس نمبری!

یہ آنریبل چودھری صاحب جب کونسل آف اسٹیٹ کے اجلاس میں شرکت کے لئے جاتے تو اپنی روانگی کی باضابطہ اطلاع متعلقہ پولیس اسٹیشن کو دیتے۔ لوگ کہا کرے چودھری صاحب اس ڈپٹی کمشنر کا بُرا ہو جس نے آپ جیسے شریف آدمی کو جو "آنریبل" بھی ہے دس نمبری بنا رکھا ہے تو وہ مسکرا کر کہتے کہ اس میں کیا قباحت ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ میں دس نمبر یں ہوں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میں "نمبردار" ہو گیا ہوں ـــــ جب اس ڈپٹی کمشنر کا تبادلہ ہو گیا اور نئے ڈپٹی کمشنر آئے تو آنریبل چودھری صاحب نے درخواست دی کہ ان کا نام دس نمبر سے خارج کر دیا جائے۔ لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوئی ـــــ ڈپٹی کمشنر نے کہا۔ یں مجبور ہوں۔ حکومت کے "پرسٹیج" کا سوال ہے۔ اگر میں پہلے فیصلہ کو مسترد کردوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت نے غلطی کی تھی ـــــ توبہ ـــــ توبہ ـــــ حکومت اور کوئی غلطی کرے؟ یہ قطعی غیر ممکن ہے۔ حکومت کبھی غلطی نہیں کرتی۔

یہ ڈپٹی کمشنر آئے اور چلے گئے نئے ڈپٹی کمشنر نے آکر اپنے پیشرو کی مکھی پر مکھی ماری۔ یہ چکر چلتا ہی رہا اور آخرکار خدا خدا کر کے "آنریبل" صاحب دس نمبر سے نکلے ——— اور جنگ کے دوران حکومت نے ان کو "خان بہادر" بنا دیا۔ وہ اب تک خان بہادر ہیں اور اپنے نام کے ساتھ یہی خطاب بھی لکھتے ہیں۔ حالانکہ مسلم لیگ کی تحریک ترک خطابات کے بعد بڑے بڑے ٹوڈیوں نے "خان بہادر" قسم کے خطابات ترک کر دیئے حتیٰ کہ اپنے حفیظؔ جالندھری نے بھی خطاب ترک کر دیا وہ اب صرف خان صاحب ہیں۔

آپ کہیں گے آخر یہ دس نمبر کی بات کا سلسلہ آج میں نے کیوں شروع کر دیا؟ بات اصل میں یہ ہے کہ میں لائل پور میں حضرت پیر و مرشد مولانا عبدالمجید سالکؔ سے ملنے کے لئے وہاں ایک ہوٹل میں گیا۔ مینجر سے پوچھا کہ :-

"مولانا کس کمرے میں ہیں؟" مینجر نے ہوٹل کے ملازم کو جس کی عمر غالباً پچاس کے لگ بھگ ہوگی۔ "بلوائیے" کہکر بلایا اور کہا ——— "ان کو دس نمبر میں لے جاؤ" ——— میں سٹ پٹایا۔ یاالٰہی یہ کیا ماجرا ہے کہ میں بھی آنریبل چوہدری کی طرح دس نمبر میں شامل ہو رہا ہوں لیکن یہ غلط فہمی اس وقت دور ہوگئی

جب میں مولانا سالکؔ کے کمرے کے سامنے پہنچا۔ کمرے کے دروازے پر لکھا تھا "نمبر دس"۔

میں نے حضرت پیر و مرشد سے کہا کہ آپ تو دس نمبر میں تھے لیکن آپ کی خاطر میں بھی دس نمبر میں آ گیا ہوں یہ معلوم نہیں کہ یہ "بستہ الف" ہے یا "بستہ ب" بہرحال میں "دست بستہ" حاضر ہوں ــــ مولانا مسکرائے اور کہنے لگے کہ عجیب اتفاق ہے کہ آج سے دو برس پہلے میں مری کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا تھا وہاں بھی میرے کمرے کا نمبر دس تھا اور یہاں بھی میں دس نمبر میں ہوں۔ یہ دانستہ طور پر نہیں ہوا بلکہ ؎

یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

مولانا نے ایک دلچسپ بات یہ بھی سُنائی کہ ایک مرتبہ ان کے رفیق مولانا غلام رسول مہر کشمیر گئے ہوٹل میں سیّاحوں کی اس قدر بھیڑ تھی کہ کوئی کمرہ نہ مل سکا آپ نے کوشش کی کہ کوئی ایسا مکان ہی مل جائے جو کسی نے "سیزن" کے لئے لے رکھا ہو۔ اور وہ "سیزن" سے پہلے جا رہا ہو ــــ لیکن یہ کوشش رائیگاں گئی بالآخر مولانا ایک ہاؤس بوٹ میں ٹھہرے۔ اس ہاؤس بوٹ کا نمبر تھا چار سو بیس۔

پس ثابت ہوا کہ مدیرانِ "انقلاب" قسمت کے دھنی ہیں ایک کی قسمت میں چار سو بیس لکھا ہے اور دوسرے کی قسمت میں آنریبل چوہدری صاحب خاں بہادر کی طرح دس نمبر۔

لاہور کے ایک اور خاں بہادر (جو پریس برانچ کے انچارج تھے) کا فون نمبر ۴۴۲۰ تھا یار لوگ انہیں "چار ہزار چار سو بیس" کہتے تھے۔ چار سو بیس کے سلسلہ میں ایک اور ـــــ دلچسپ بات سنئے ایک بار "مرحومہ سٹی مسلم لیگ کونسل" کا اجلاس بسلسلۂ انتخابات خالق دینا ہال میں ہو رہا تھا۔ ایک صاحب اسٹیج پر نمبر پکارتے تھے اور نمبر کے مطابق کونسل کا ہر رکن ووٹ دیتا تھا۔ جب چار سو انیس نمبر پکارا گیا تو ہر شخص یہ دیکھنے کا منتظر تھا کہ کون چار سو بیس آتا ہے جب اسٹیج پر سے آواز آئی ـــــ "چار سو بیس" (۴۲۰) تو ایک بڑی لمبی داڑھی والے بزرگ ووٹ دینے کو اٹھے اس پر لوگوں کو تعجب ہوا۔ کہ یہ لمبی داڑھی والا آدمی کس طرح چار سو بیس ہو سکتا ہے۔؟

(۲۲ر مارچ ۵۶ء)

"جموُرت" —— "جندہ باد"!

جی ہاں —— اب جمہوریت کا دور ہے اب کوئی "گھپلا" نہیں چلے گا —— وہ زمانہ لد گیا جب گنتی کے پڑھے لکھے لوگ ہم جاہل عوام کو بیوقوف بناتے تھے یہ پڑھے لکھے لوگ مسائل کو سوچتے تھے۔ فصاحت و بلاغت کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے تقریریں میں بھی تحریر میں بھی —— دور دور تک ان کی دھوم تھی۔ ہر کہیں ان کے چرچے تھے ان کی لیڈری چمکتی تھی ان کا سکّہ چلتا تھا ان کے اشارے پر ہم چلتے تھے مگر اب جمہوریت کا دور ہے۔ یہ مٹھی بھر پڑھے لکھے لوگ اب لیڈر نہیں بن سکتے۔ "سیٹھ ٹیوب جی ٹائر جی" نے صاف کہہ دیا کہ

جاستی آدمی "بے پڑھیلا ہے" نہیں تو پانچ چھ "چوپٹری" پڑھیلا ہے اور کمتی آدمی "پڑھیلا" ہے یہ کیسا ہو سکتا ہے کہ جاستی آدمی لوگ کا وہ لوگ لیڈر بن جائے جو کمتی ہے؟ معلوم کہ "جمورت" (جمہوریت) کس کو بولتا ہے؟ جمورت (جمہوریت) اس کو بولتا ہے کہ جو آدمی جاستی ہے ان کا آدمی کو کرسی ملے یہ بات برو بر ہے کہ ہم پیسے والا ہے۔ اور پیسے والا آدمی کمتی ہے۔ بے پیسے والا جاستی ہے مگر ہم یہ بات نہیں کرتا ہے ہم تو یہ بات بولتا ہے کہ ہم "بے پڑھیلا" ہے اس واسطے "جمورت" "پڑھیلا لوگ" کو ممبر نہیں بنائے گا۔ ہم کو بنائے گا

"سیٹھ ٹیوب جی ٹائر جی" کی بات درست نکلی واقعی "جمورت" جیت گئی کیونکہ مغربی پاکستان اسمبلی کے الیکشن میں "پڑھیلا لوگ" کمتی آئے اور "بے پڑھیلا لوگ" جاستی آئے۔ جہاں تک بقول "سیٹھ ٹائر جی ٹیوب جی" "جمورت" کا تعلق ہے "جاستی لوگ" کا آدمی ہی آنا چاہیئے تھا۔ سو وہ آ گیا پورے پاکستان میں کراچی ہی ایک ایسا شہر ہے جہاں پڑھے لکھوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ جہاں تعلیم یافتہ آبادی کا تناسب تیس فیصد ہے۔ مگر سیٹھ جی کی "جمورت" کے پیش نظر تیس فیصد لوگوں کو کیا حق ہے کہ وہ ستر فیصد لوگ کے نمائندہ بنیں۔ یہی

وجہ ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے کراچی میں "جمورت" ——— "جندہ باد" ہو گئی ہے۔ یہاں سے جو لوگ اسمبلی میں گئے ہیں وہ آبادی کے تناسب کے لحاظ سے گئے ہیں وہ آبادی کے تناسب کے لحاظ سے گئے ہیں۔ بلکہ "جمورت" نے عظیم فتح حاصل کی ہے اور "پڑھیلا لوگ" شکست کھا گئے ہیں یا آگے ہی نہیں بڑھے۔

آپ شاید بھول گئے ہوں مگر میں نے "ون یونٹ اسمبلی" کے الیکشن سے بہت پہلے ایک بات کہی تھی وہ یہ کہ میں نجومی نہیں ہوں۔ کہ پیشگوئی کر سکوں مگر ایک چیز کہہ دینا چاہتا ہوں کہ انشاء اللہ اسمبلی میں بڑے بڑے کارخانہ دار ——— زمیندار ——— مالدار ——— حتیٰ کہ تھانیدار ——— آئیں گے۔ اور یہی "تختہ دار" ——— انشاء اللہ ——— "تخت دار" میں تبدیل ہو جائے گا۔ باوجود اس کے کہ میں نجومی نہیں ہوں لیکن میری بات بقول سیٹھ جی سولہ آنہ ٹھیک نکلی ——— آئیے اس نقطہ نگاہ سے میں آپ کو اسمبلی کی سیر کراتا ہوں۔ اراکین کی فہرست سامنے رکھ کر آپ بھی جائزہ لیجئے اسمبلی میں کون کون گیا ہے:۔

مل مالکان	۱۵
سردار	۱۴
ملک	۱۵
میر	۲۰
پیر	۹
پیرزادے	۳

سیّد	۱۹
چوہدری	۲۸
میاں	۱۱
جاگیردار	۱۵
زمیندار	۲۵
سیٹھ	۲۲
خاں	۳۵
نواب اور نواب زادے	۱۰
بیگمات	۸
	۲۴۹

ہاں تو تین سو دس کے ہاؤس میں یہی طبقے ہیں۔ یہ تو نہیں کہ ان میں "پڑھیلا لوگ" نہیں ہیں۔ ان میں تعلیم یافتہ بھی ہیں۔ تجربہ کار بھی ہیں۔ ذہین بھی ہیں مگر بقول "سیٹھ ٹیوب جی ٹائر جی"، "جموریت" جاستی ہے۔ اب رمضانی بڑی سنجیدگی سے سوچ رہا ہے کہ اپنے لڑکوں کو اسکول سے اُٹھالے اور کام دھندے پر لگائے کیوں کہ "پڑھیلا لوگ" کا "چانس" اب "خلاص" ہوگیا ہے اور "جموریت" زور پکڑ رہی ہے۔ رمضانی کے "بچہ لوگ" بھی اب پیسہ کمانے اور ہر جائز اور ناجائز ذریعے سے پیسہ کمانے کی فکر میں رہیں گے۔ جب ان کے پاس دولت جمع ہوجائے گی تو وہ بھی "جموریت" خریدیں گے۔ اور نوٹ دے کر ووٹ لیں گے اگر وہ پڑھے لکھے نہیں ہوں گے مگر "پڑھیلا لوگ" کو اپنے "انڈر" میں رکھ لیں گے جو اِن کے

بیان لکھیں گے ٹائپ کریں گے اور پریس کو بھیج دیں گے۔ ان میں مبارک باد کے بیان زیادہ ہوں گے۔ رمضانی کے "بچہ لوگ" نہایت خاموشی کے ساتھ اسمبلی میں تقریریں سنیں گے اور کبھی کبھی اونگھتے بھی رہیں گے بلکہ سو بھی جائیں گے کیوں کہ اسمبلی میں "رہائش اور خوراک" کا تو نہیں البتہ ـــــ "سونے کا اعلیٰ انتظام ہے" جب تالیاں بجیں گی یہ جاگیں گے اور جب لوگ ہاتھ کھڑا کریں گے یہ بھی اپنے دھڑے کے ساتھ ہاتھ کھڑا کر دیں گے ـــــ انشاء اللہ ـــــ ہاں تو نعرہ لگائیے۔

"جمورت" ـــــ "جندہ باد"!

(۲۵ رجنوری ۵۶ء)

رحمان کا پھجل ہو گیا

"سیٹھ ٹیوب جی ٹائر جی" بہت خوش ہیں کہ ان کے "جونا دوست" مسٹر فضل الرحمان خیر سے پھر مسلم لیگ میں آ گئے ہیں ۔ یعنی

مکّے گئے مدینے گئے کربلا گئے
جیسے گئے تھے ویسے ہی ہر پھر کے آ گئے

سیٹھ ٹیوب جی نے کہا :۔

معلوم ۔ آج ہم بوت گھش ہے ۔ بوت ہی گھش ہے (بہت ہی خوش ہے) مسلم لیگ پر اللہ کا پھجل ہو گیا ۔ پھجل الرحمان باہر نکل گیا تھا ۔ پھر اندر آ گیا اب جتنا لوگ ہے وہ سب اندر آئے گا ۔ اندر نہیں آئے گا تو کدھر جائے گا؟

سیٹھ جی واقعی درست فرماتے ہیں ۔ ایسے نامی گرامی اور "مشہور لوگ"

"ضراط مستقیم" سے بھٹک کر پھر ان میں آ رہے ہیں جن پر "انعام خاص" ہوا نہ کہ ان میں تحقیق کہ جن پر غضب نازل ہوا۔ ایسے ایسے مقدسین جن کا احترام بچّہ بچّہ کرتا ہے اگر مسلم لیگ میں آئے اور مسلم لیگ میں جان نہ پڑی تو یہ اس دور کا اتنا بڑا سانحہ ہوگا کہ اس پر آنے والے دور کا مؤرخ آنسو بہائے گا اتنے آنسو کہ صفحہ قرطاس کی سیاہی دُھل جائے گی یعنی مطلع صاف ہو جائے گا۔

اب تک یہ معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا کہ مسلم لیگ میں جان کیسے ڈالی جائے اگرچہ نسخہ موجود تھا اور ہرچہ ترکیبِ استعمال بھی ہمراہ تھا مگر وہ کچھ ایسے "خطِ شکستہ" میں لکھا ہوا تھا جسے پڑھنے کے لئے ایک "ماہرِ تعلیم" کی ضرورت تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ "ماہر تعلیم" آ گیا۔ اگرچہ "نامی گرامی اور مشہور" نور الامین نے بھی پرچہ ترکیب استعمال کو پڑھنے کی کوشش کی لیکن وہ اس میں ناکام رہے۔ مسٹر فضل الرحمٰن انشاء اللہ مسلم لیگ میں جان ڈالیں گے اور ہر کوئی کہے گا ؎

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستان بنا دیا

یہ کہنا بھی غلط ہے کہ وہ مسلم لیگ میں جان ڈالیں گے بلکہ ہم تو سمجھتے ہیں کہ وہی "جانِ مسلم لیگ" تھے وہ آ گئے تو یوں سمجھئے کہ مسلم لیگ میں جان آ گئی دیو اور پریوں کی کہانیوں میں ہم سُنا کرتے تھے۔ "دیو لوگ" کی جان طوطے میں ہوتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب وہ طوطا مل گیا ہے لوگ سمجھ رہے تھے کہ مسلم لیگ اس لئے بے حس و حرکت پڑی ہے کہ کسی کمبخت نے اس کی گردن مروڑ دی تھی اب معلوم

ہوگیا کہ یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی تھی اور خدا کے فضل و کرم سے وہ طوطا جس میں مسلم لیگ کی جان تھی زندہ اور صحیح سلامت ہے۔ نشتر صاحب کا فرض ہے کہ اس طوطے کو پالیں اور اسے دشمنوں کی نظر بد سے بچائیں۔ بہرحال "سیٹھ ٹیوب جی ٹائر جی" بہت ہی خوش ہیں۔

سیٹھ ٹیوب جی ٹائر جی کہتے ہیں کہ مسلم لیگ کو اب "بج نس" بھی چالو کرنا چاہیئے کیوں کہ اس کو ایک "ماہر تجارت" مل گیا ہے۔ ایسا "ماہر تجارت" جس نے ملک کی تجارت کو چار چاند لگا دیئے یہی وجہ ہے کہ اب تک تاجر حضرات ان کو نہیں بھولے انہوں نے فیاضی اور سخاوت سے کام لیا اور اس کی پروانہ کی کہ "اسٹرلنگ" کا بیٹرا ہو رہا ہے۔ ان کی پالیسی "خدمت خلق" تھی انہوں نے دل و جان سے "خدمتِ خلق" کی۔ یہی وجہ ہے کہ آج "خلق خدا" ان کی جان و مال کی دعائیں دے رہی ہے اگر "مسلم لیگ نے "سیٹھ ٹیوب جی ٹائر جی" کے مشورے پر عمل کیا اور "بج نس" چالو کر کے اسے "ماہر تجارت" کی خدمات سے فائدہ اٹھایا تو انشاءاللہ مسلم لیگ کی مالی پوزیشن اچھی مضبوط اور مستحکم ہوگی اگر مالی پوزیشن اچھی ہوئی تو ظاہر ہے کہ اس میں جان پڑے گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بقول سیٹھ ٹیوب جی ٹائر جی مسلم لیگ "ہول سیل" ریٹ میں "جمہوریت" خریدنے بلکہ "جمہورت" کا ذخیرہ کرے اور زیادہ سے زیادہ کمائے۔ بہرحال تمام حلقوں میں بڑی مسرت کے ساتھ اس خبر کو سنا گیا ہے کہ مسٹر فضل الرحمٰن مسلم لیگ میں آگئے ہیں اور "ٹیوب جی ٹائر جی" کی زبان میں اب مسلم لیگ پر ــــــ رحمٰن کا پھل ہوگیا ہے۔

(۱۵ر فروری ۱۹۵۶ء)

"چچا موج دین کی موج"

"رمضانی" تو خیر تھا ہی ــــــ لیکن یہ "چچا موج دین" بھی بڑا موجی آدمی ہے ــــــ افطاری سے آدھ گھنٹہ کے بعد آیا اور کہنے لگا ــــــ "میں روزہ کھولوں گا" میں نے کہا۔ "چچا افطاری تو ہو لی اور آدھ گھنٹہ اوپر بھی ہو لیا ــــــ اب افطاری کیسی ؟" کہنے لگا۔ "دن بھر کا رکھا ہوا روزہ ایک منٹ میں کیسے کھول دیں۔ میں تو ایک گھنٹہ کے بعد کھولتا ہوں۔ زیادہ ثواب ملتا ہے نا" ؟ میں نے کہا۔ "چچا ــــــ یوں تو روزہ مکروہ ہو جاتا ہے ــــــ یہ تمہیں کس نے بتایا ہے کہ زیادہ ثواب ملتا ہے ؟ اب اگر چار فرض کی جگہ دس فرض پڑھو۔ تو کیا زیادہ ثواب ملے گا ؟ چچا یہ دین کا معاملہ ہے۔ تم اس میں کچھ گھٹا

بڑھا نہیں سکتے ۔"

پچانے کہا "خیر تمہاری بات مان لی مگر دیر نہ کرو ۔ مکروہ ہو رہا ہے روزہ"

میں نے کوکو کولا منگوایا ——— پچانے کہا ۔" میں اس سے روزہ نہیں کھولوں گا چاہے روزہ مکروہ ہو جائے ۔"

میں نے کہا ! آخر کیوں نہیں کھولو گے اس سے روزہ ؟

کہنے لگا "کوکو کولا پینا خلاف سنت ہے ——— جلدی سے کھجوریں منگواؤ ۔"

خیر صاحب کھجوریں منگوائی گئیں اور پچانے افطاری کی ۔

میں نے کہا ۔" پچا کہو ادھر کا پھیرا کیسے ہوا آج ؟"

پچانے کہا ۔" مجھے تم سے سخت بلکہ سخت سے بھی سخت ——— اور سخت سے بھی سخت سے ——— بھی اور زیادہ سخت شکایت ہے ۔"

میں نے کہا ۔" پچا کیا کوئی گستاخی ہو گئی مجھ سے تمہاری شان میں ؟"

کہنے لگا ۔" ارے تو گستاخی کہتا ہے ۔ تو تو بے عزتی خراب کر رہا میری ——— میں تجھ سے بات کروں اور تو جا کر ریڈیو پر لوگوں کو سُنا دے اور کہے کہ رمضان شریف برکت کا مہینہ ہے ۔ اس لئے خوب بلیک مارکیٹ کرو اور چیزوں میں خوب ملاوٹ کرو ۔ مہینہ بھر میں اگر سال بھر کی روٹیاں نہ ملیں تو پھر برکت کیا ہوئی ؟ ——— یہ تو میں نے تجھ سے کہا تھا اور تو نے جہان بھر کو سُنا دیا اور بدنام کر دیا مجھ کو ۔"

میں نے کہا "چچا تو بدنام کیسے ہوا؟ تیرے بھائی بندوں نے تو "زندہ باد" کہا تجھ کو ——— اور وہ اب اس فکر میں ہیں کہ تجھے سپاسنامہ پیش کریں۔ پھولوں کے ہار ڈالیں تیرے گلے ——— ڈنر دیں تیرے اعزاز میں ——— اور تجھے اونٹ پر بٹھا کر۔ اونٹ پر اس لئے کہ تو اور اونچا ہو جائے۔ تیرا جلوس نکالیں۔ پھر جلسہ کریں اور جب تو الیکشن میں کھڑا ہو تو سب ملاوٹ کرنے والے اور بلیک مارکیٹ کرنے والے تجھے ممبر بنا کر اسمبلی میں بھیجیں اور اسمبلی میں تو یہ قانون منظور کرائے کہ جو شخص ملاوٹ نہیں کرے گا بلیک مارکیٹ نہیں کرے گا اس کو چھ مہینہ کی پھانسی دی جائے گی۔"

"دیکھ چچا ——— میں نے لوگوں کو تو یہ نہیں بتایا کہ چچا برف کی بلیک مارکیٹ کرتا ہے اور خصوصاً سحری کے وقت ——— یعنی افطاری کے وقت ذرا کم اور سحری کے وقت ذرا زیادہ ——— اور پھر چچا روزہ بھی رکھتا ہے بلکہ کوئی "روزہ خور" اسے سگریٹ پیتا نظر آجائے دن میں تو جما کے ایک تھپڑ بھی رسید کرتا ہے اس کے گال پر ——— اور اسے کہتا ہے ——— ارے تجھ کو منہ کالا ہی کرنا تھا تو پردے کے پیچھے یعنی احترام کے پیچھے کر لیا ہوتا ——— یہ سگریٹ سلگا کر تو ہم کو کیوں جلاتا ہے۔"

چچا نے کہا۔ "واقعی یہ تو نے اچھا کیا کہ لوگوں کو یہ بات نہیں بتائی ورنہ وہ کہتے ——— کہ خود تو بلیک مارکیٹ کرتا ہے اس مبارک مہینے میں یعنی منہ کالا کرتا ہے اور اگر کوئی دوسرا منہ کالا کرے تو اس کے تھپڑ مارتا ہے۔"

چچا! یہاں تک کہہ پایا تھا کہ میں نے کہا ——— "چچا بیڑی تو پلاؤ"۔
چچا نے کہا ——— بیڑی تو میں کہہ چکا ہوں کہ تجھ کو نہیں پلاؤں گا تو جھٹلاتا ہے میری باتوں کو۔ میں خود بیڑی پیوں گا اور تجھے جلاؤں گا بیڑی ہمارے پاس ہے جلنے والا جلا کریں۔"
خیر بڑی ردّوکد کے بعد میں نے چچا کو منا لیا اور ہم دونوں نے بیڑی کے بھرپور کش ——— "یا پیر علی محمد راشدی"! کا نعرہ لگا کر لگائے۔

کش لگاتے ہی پہلے تو چچا کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور پھر ان میں "سُرخ سویرا" لہرانے لگا یعنی اس کی آنکھیں کمیونسٹ ہوگئیں یعنی لال ہوگئیں چقندر کی طرح۔ مجھے یقین ہے کہ ضرور کوئی "فلک سیر" گولی ملائی گئی تھی بیڑی میں اب مجھے تشویش ہوئی کہ میرے ساتھ بھی یہ "عمل" نہ ہوا ہو۔ چچا نے مجھے آنکھیں دکھائیں۔ میں نے چچا کو آنکھیں دکھائیں مگر کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ آخر کار آئینہ منگوایا گیا۔ میری آنکھیں تو خیر خدا کا شکر ہے کہ ٹھیک تھیں مگر چچا نے مان لیا کہ اس کی آنکھیں سُرخ ہیں۔ انگارے کی طرح ——— مگر ساتھ ہی قسم بھی کھائی کہ بیڑی بالکل "خالص بیڑی" ہے۔ اب چچا نے پینترا بدلا۔ اور کہا۔ "دیکھو بالو! ایک قانون کی بات پوچھتا ہوں تجھ سے ——— سچ سچ بتا۔ اور خدا کو حاضر ناظر جان کر بتا کہ غریبوں کا نشہ یعنی چرس تو بند کر دیا ہے حکومت نے اور امیروں کا نشہ یعنی شراب آزاد ہے۔ جب ہم سب آزاد ہیں تو غریبوں کا نشہ کیوں بند ہے اور امیروں کا کیوں کھلا ہے؟ پھر کہا جاتا ہے۔

ہم غریبوں کی خوش حالی چاہتے ہیں۔ غریب بیچارے گھڑی بھر کو بھی خوشحال نہ ہو سکیں اور خوش حال لوگ خوش حال سے بھی خوش حال ہوں؟"

میں نے اعتراف کیا کہ "چچا! تو نے واقعی لاجواب بات کہی ہے۔ بڑی دُور کی کوڑی لایا ہے تو ـــــ بس تیرا بھی جواب نہیں اور تیری بات کا بھی جواب نہیں۔"

چچا اس "مسکہ پالش" سے بہت خوش ہوا اس نے فوراً جیب سے بیڑی نکالی اور کہا ـــــ "لے ایک بیڑی اور پی۔"

چچا نے بیڑی سلگائی میں نے اس کی بیڑی سے بیڑی لگائی کیوں کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ ایک بار پھر ہم نے "یا پیر علی محمد راشدی" کا نعرہ لگا کر بیڑی کا بھرپور کش لگایا۔ چچا کی آنکھوں میں پھر چمک پیدا ہوئی۔ پھر چچا کی آنکھوں میں "سرخ سویرا" لہرایا۔ اب چچا موج دین واقعی موج میں تھا۔ چچا نے فاتحانہ انداز سے مجھے دیکھا اور بولا ـــــ "ایک قانون کی بات اور سن ـــــ تو نے کہا کہ میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور برف کی بلیک بھی کرتا ہوں یعنی دن کو نیکی کرتا ہوں اور شام کو برائی اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک نیکی ہوئی اور ایک برائی لہذا حساب برابر۔ اب تو مجھے بتا کہ میں کہاں جاؤں گا؟"

میں نے کہا ـــــ "چچا میں مولوی نہیں ہوں کہ کوئی فتویٰ دوں مگر جو شخص بندوں سے برائی کرے گا وہ جنت میں تو نہیں جا سکتا۔"

چچا نے کہا۔ "تو پھر یہ کہہ دے کہ میں جہنم میں جاؤں گا۔"

میں نے سوچا کہیں چچا پھر نہ بگڑ بیٹھے اور کہہ دیا کہ "چچا میں سمجھتا ہوں تو اعراف میں رہے گا یعنی جنت اور جہنم کے "کھوکھرا پار" میں۔ کیوں کہ تو کہتا ہے کہ تو نیکی اور بدی کا حساب برابر کر دیتا ہے مگر چچا! مذاق کافی ہو لیا۔ اب میں تجھے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اللہ اپنا گناہ تو معاف کر سکتا ہے۔ وہ رحیم بھی ہے کریم بھی۔ لیکن جو لوگ بندوں کے گناہ کرتے ہیں ان کے لئے وہ جبار بھی ہے اور قہار بھی۔ پس اے پیارے چچا! ۔ تو عبرت پکڑ۔"

یہ کہنا تھا کہ چچا عبرت پکڑنے کی جگہ اپنی ٹوپی پکڑ کر اٹھ کھڑا ہوا —— اور لگا کہنے —— "تو بڑا گستاخ آدمی ہے تو نے ایک بندے کا دل توڑا ہے اور وہ بھی رمضان شریف میں اسی لئے میں جاتا ہوں اور تو —— جا جہنم میں!"

(۳ر مئی ۱۹۵۶ء)

معزز ووٹران کے نام

معلوم نہیں عام انتخاب کب ہوں گے۔ مگر میں پیشگی کھڑا ہو گیا ہوں اور نہایت ہی دردمندانہ اپیل پیشگی معزز ووٹران کے نام کر رہا ہوں تاکہ ان کے ووٹ کی "ایڈوانس بکنگ" میرے نام ہو جائے۔ ہاں تو۔

"بُرادرانِ موٹراں ——— اے میرے پیارے ووٹراں"

میں خدا کو حاضر ناظر جان کر جو کچھ کہوں گا ——— سچ کہوں گا ——— سچ اس لئے کہوں گا کہ ایک "حکیم الفٹ پاتھ" سے میں نے کراچی کارپوریشن کے سامنے ایک شعر سُنا ہے ؎

صادق ہوں اپنے قول کا غالب خدا گواہ　　　کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

(بعد میں معلوم ہوا کہ اس شخص کا نام محمد صادق تھا) ——— میں اگر چاہوں تو جھوٹ بول کر بھی کام نکال سکتا ہوں کیوں کہ ابھی تک کوئی ایسا قانون نہیں بنا جس کی رو سے جھوٹ بولنا جرم ہو۔ اگرچہ دھوکہ دینے والوں کے خلاف کاروائی ہوتی ہے مگر ——— اے میرے پیارے ووٹرو! آپ نے اپنی آنکھ سے دیکھا ——— اپنے کانوں سے سنا کہ ووٹ لیتے وقت ہر امیدوار نے آپ سے لمبے چوڑے وعدے کئے لیکن کرسی پر بیٹھتے ہی وہ ان تمام وعدوں کو بھول گیا۔ کیا اب تک کسی ایسے آدمی کے خلاف جھوٹ بولنے اور دھوکہ دینے کا مقدمہ چلا؟ ——— کیا قانون کی مشین حرکت میں آئی۔ اتنا بڑا "فراڈ" بھی نظرانداز کر دیا گیا کیوں؟ اس لئے کہ ——— اے میرے معزز ووٹران! ——— "سب چلتا ہے"! ہاں تو میں جھوٹ بول سکتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے لیکن جھوٹ کے پر ضرور ہوتے ہیں جن کی مدد سے وہ آسمان کی بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے ——— مگر ——— اے میرے جان سے زیادہ پیارے ووٹران! ———۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ آپ مجھے توپ دم کر دیں۔ کولہو میں پلوا دیں۔ مجھے قریشی بس کے نیچے کچل دیں مگر میں ہرگز ہرگز ——— جھوٹ نہیں بولوں گا ——— مجھے یقین ہے کہ جس طرح اب تک آپ نے جھوٹ بولنے والوں کو ووٹ دے کر ان کی سرپرستی کی ہے۔ آپ اپنا "مُسلم لیگی نوٹ" (سو روپے کا سبز لوٹ) سے بھی زیادہ قیمتی ووٹ مجھے دیں گے۔ میں یہ کہہ سکتا تھا کہ اپنے خادم کو ووٹ دیں مگر معاف کیجئے میں آپ کا خادم نہ تھا ——— نہ ہوں ——— اور نہ انشاءاللہ کبھی ہوں گا ——— میں آپ کا نہیں بلکہ "اپنا خادم"

ہوں ــــ اے میرے بڑے ہی پیارے ووٹران ! میں اس نکتہ کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ ایک نیا نعرہ آپ کو دوں کیونکہ "زندہ باد" سے لے کر ــــ "ریل کا پہیہ جام کرینگے" تک جتنے نعرے ہیں وہ مسلم لیگ کی طرح یوں سمجھئے کہ بس ــــ "زندہ باد" ہو چکے ہیں وہ نعرہ یہ ہے !

ــــ اپنا خادم قوم کا خادم ــــ !

ہاں تو ــــ اے میرے معزز ووٹران ــــ !

پہلے آپ پھیپھڑوں کی پوری قوت کے ساتھ پورا "ساؤنڈ بکس" کھول کر یہ نعرہ لگائیں تاکہ میں اس نکتہ کی وضاحت کروں ۔ میں کہہ چکا ہوں کہ جو کچھ کہوں گا خدا کو حاضر ناظر جان کر سچ کہوں گا ۔ اور "حکیم الفٹ پا تھ" کا شعر ہرگز نہیں بھولوں گا جس کا نام محمد صادق تھا ۔

اے میرے تاج محل سے حسین اور قطب مینار سے اونچے معزز ووٹران ! یہ تو آپ جانتے ہیں کہ قوم اصل میں انسان کے مجموعے کا نام ہے بالکل اسی طرح جیسے تسبیح دانوں کے اتحاد کا نام ہے ــــ اگر فرد نہیں ہے تو قوم نہیں ہے ۔ اگر دانے نہیں ہیں تو تسبیح نہیں ہے ۔ پس لازم آتا ہے کہ ہر فرد اپنی تعمیر کرے ۔ اگر وہ دوسروں کا ٹھیکیدار بنے گا تو نقصان اٹھائے گا بلکہ "پی ڈبلو ڈی والے" اس کی اصل لاگت بھی اس کو نہیں دیں گے اور بل اکاؤنٹس والوں کی فائلوں میں دفن ہو جائے گا ۔ پس ثابت ہو گیا کہ فرد کی تعمیر قوم کی تعمیر ہے ۔ لہذا زور کا ایک نعرہ لگائیے :۔

● ــــ "اپنا خادم قوم کا خادم ہے ــــ"

اے معزز ووٹران! —— میں سچ کہنے کا وعدہ کر چکا ہوں۔ اس لئے صاف صاف لفظوں میں کہتا ہوں کہ اگر آپ نے مجھ پر اعتماد کیا تو میں اکیس۲۱ نکاتی پروگرام پر عمل کروں گا وہ پروگرام یہ ہے :-

۱۔ لائسنس لوں گا
۲۔ کنٹرول ریٹ پر کاربن لے کر بلیک میں بیچوں گا۔
۳۔ چین کے کوئلے کی دلالی میں "منہ کالا" کروں گا۔
۴۔ روس سے کاغذ لا کر مہنگے داموں بیچوں گا۔
۵۔ الاٹمنٹیں کراؤں گا۔
۶۔ بنک کھول کر اس کا دیوالہ نکالوں گا۔
۷۔ ایک سے زیادہ شادیاں کروں گا۔
۸۔ دکانوں، زمینوں اور جائیدادوں پر زبردستی قبضہ کروں گا۔
۹۔ وفاداری کے اظہار کے لئے "ڈنر" دوں گا۔
۱۰۔ سپاسنامے پیش کروں گا۔
۱۱۔ بوگس انجمنیں بناؤں گا اور اس کی طرف سے سپاسنامہ دوں گا۔
۱۲۔ جاگیرداری ختم کرنے کی دھمکی دے کر جاگیرداروں سے روپیہ وصول کرونگا
۱۳۔ رشوت خور افسروں کے تبادلے ان مقامات پر کر کے جہاں رشوت زیادہ ملے ان سے رشوت لوں گا۔
۱۴۔ بنک کے پیسے کو اپنے باپ کا بیمہ سمجھ کر اپنے کاروبار میں لگاؤں گا
۱۵۔ ہر کرسی پر بیٹھنے والے کو مبارک باد دوں گا۔

۱۶- ہر کرسی سے اترنے والے پر لعنت بھیجوں گا۔

۱۷- بسیں چلاؤں گا۔

۱۸- تعلیم ادارے کھول کر تعلیم کی "بلیک مارکٹ" کروں گا۔

۱۹- اخبار نکالوں گا جس میں میرے بیان اور میری تصویریں چھپیں گی۔

۲۰- اس اخبار پر اپنا نہیں بلکہ لوگوں کا پیسہ لگاؤں گا اور پروپیگنڈہ اپنا کروں گا۔

۲۱- لاٹ صاحب سے ملوں گا تاکہ کوٹ سرکلر میں میرا نام آئے اور لوگوں پر اس کا رعب پڑے کہ اس کی دُور تک رسائی ہے۔

اے معزز ووٹران! یہ تو میرا اکیس نکاتی پروگرام ہے اس کے علاوہ بھی میں خدا کو حاضر ناظر جان کر آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہر وہ کام کروں گا جس سے میری زیادہ سے زیادہ تعمیر ہو کیوں کہ میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ اپنی تعمیر قوم کی تعمیر ہے اور وہ جو کہا ہے صوفی غلام مصطفٰے تبسم نے ؎

اپنا اپنا غم کھاؤ اپنا اپنا درد سہو

تو بس —— میں اپنا غم کھاؤں گا اپنا درد سہوں گا —— جہاں آپ کا خون گرے گا وہاں میں اپنا پسینہ بھی نہیں بہاؤں گا۔ اب آپ کے اختیار میں ہے کہ آپ مجھے "مسلم لیگی نوٹ" (سو روپے کا سبز نوٹ) سے زیادہ قیمتی ووٹ دیں۔ آپ نے جھوٹوں کو ووٹ دیئے۔ آپ نے ان کو ووٹ دیئے جنہوں نے آپ کو اس کے بدلے میں دھوکہ دیا۔ میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں سچا آدمی ہوں اسی لئے میں نے سچ بولا ہے

"حکیم الفٹ پاتھ" کے کہنے کے مطابق ؎

کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

پس اے معزز ووٹران ! ایک بار پھر نعرہ لگائیے۔ کہ !

● ——— "اپنا خادم قوم کا خادم ہے"

اور پھر نعرہ لگاتے ہوئے ووٹ "کالے رنگ" کے بکس میں ڈالئے !

(۲۲ر جون ۵۶ء)

"بٹوارے سے پہلے"

یہ بٹوارے سے پہلے کی بات ہے پنجاب کے ایک ضلع میں ایک انگریز ڈپٹی کمشنر کا تقرر ہوا۔ روایت یہ تھی کہ ہر آنے والے افسر کو لوگ سلام کرتے تھے اور جانے والے کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالتے تھے۔ انگریز ان روایات سے ناواقف تھا۔ وہ صرف یہ جانتا تھا کہ اس کا فرض ضلع کے نظم ونسق کو برقرار رکھنا ہے۔ وہ اپنا تمام وقت نظم ونسق کی دیکھ بھال میں صرف کرتا تھا۔ اس کے آنے سے پہلے ضلع کے انتظام کا شیرازہ درہم برہم ہو چکا تھا اس لئے اس کا وقت اسی میں گزرتا تھا کہ کسی طرح حالات اعتدال پر آجائیں۔

جب اس ضلع کے بڑے بڑے زمینداروں کو معلوم ہوا کہ ڈپٹی کمشنر بدل گیا ہے تو وہ ابتدائی تعارف کے لئے ایک ایک کر کے آنے لگے ۔ ایک زمیندار نے اپنی آمد کی خبر ڈپٹی کمشنر کو دی اردلی نے صاحب سے کہا ۔

"فلاں چودھری صاحب آپ سے ملنے کے لئے تشریف لائے ہیں ۔"

صاحب نے کہا ۔ "پوچھو کہ ان کا کیا کام ہے ؟"

اردلی نے کہا کہ "صاحب پوچھتے ہیں کہ آپ کو کیا کام ہے ؟"

چودھری صاحب نے کہا ۔ "ان سے کہئے کہ فلاں صاحب آپ کی خدمت میں سلام کرنے کے لئے حاضر ہوئے ہیں ۔"

اردلی نے یہ پیغام صاحب کو دیا ۔ صاحب نے کہا کہ "ان سے کہہ دیجئے کہ میں اس وقت کام میں مصروف ہوں ملنے کی فرصت نہیں آپ کا سلام مجھ تک پہنچ گیا ہے اور میں بھی جواب میں سلام کہتا ہوں ۔"

گاؤں کے زمیندار نے جب یہ سنا تو مجبوراً واپس چلا گیا ۔ اگرچہ اس کو صاحب کی یہ حرکت ناگوار گزری لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکا ۔ اسی طرح بہت سے لوگ آتے رہے جب ان سے اردلی پوچھتا کہ کہئے کیا کام ہے ؟ تو وہ جواب میں کہتے کہ ہم صاحب کو سلام کرنے کے لئے حاضر ہوئے ہیں اور ان کو بھی جواب ملتا کہ صاحب کام میں مصروف ہیں آپ کا سلام ان تک پہنچا دیا گیا ہے ۔ اس لئے آپ تشریف لے جا سکتے ہیں ۔ یہ حقیقت ہے کہ بے مقصد ملنے والے حکام کا بہت سا وقت محض سلام کے لئے ضائع کرتے ہیں ——— کام دام کوئی نہیں مگر آ رہے ہیں محض سلام کرنے کے لئے ——— اب آپ ہی کہئے کہ اگر یہ لوگ جن کے سپرد ضلع کے انتظام کی باگ ڈور ہے اسی طرح اپنا وقت سلام کے

جواب میں صرف کرتے ہیں تو کام کے لئے وقت کہاں سے آئے۔؟

اس انگریز ڈپٹی کمشنر کے زمانہ میں ضلع میں ذیلداروں کی نامزدگی کا سوال آیا۔ نمبرداری یا ذیلداری کے لئے کسی صلاحیت کی اور قابلیت کی شرط نہیں۔ عموماً یہ ہوتا تھا کہ چودھری لوگ "مسکہ پالش" کر کے یہ منصب حاصل کرتے تھے۔ اب "مسکہ پالش" کی گنجائش ختم ہو چکی تھی کیوں کہ صاحب تک رسائی ہی مشکل تھی ڈپٹی کمشنر نئے نئے ولایت سے آئے تھے طبیعت بھی بڑی دلچسپ پائی تھی ان کے ذہن میں ایک تجویز آئی۔ انہوں نے ذیلداری کے تمام امیدواروں کو بلایا اور کہا:-

"دیکھو ہم تم لوگ کو ذیلدار بنائے گا۔ تم چار دن کے بعد اپنا اپنا گھوڑا لاؤ۔ یہاں "ریس" ہوگا جس کا گھوڑا آگے جائے گا ہم اس کو ذیلدار بنائے گا!"

یار لوگوں نے کبھی "شاہسواری" چھوڑ گدھے تک کی سواری نہیں کی تھی مگر ذیلداری کی امیدواری نے سب کچھ کرایا۔ چار دن تک مشق ہوتی رہی۔ چودھری صاحب کو اٹھا کر لوگ گھوڑے پر چڑھاتے تھے۔ رکاب میں پاؤں رکھ کر چودھری صاحب نے لگام پکڑی اور گھوڑا ذرا بدکا تو گھوڑا آگے اور چودھری صاحب دھڑام سے زمین پر۔ اب ملازم ان کی پگڑی اٹھا رہے ہیں کپڑے جھاڑ رہے ہیں۔ بہرحال چوتھا دن آگیا۔ سب لوگ گھوڑے لے کر آئے اور "ریس" شروع

ہوئی۔ چودھری لوگ کے گھوڑے بے لگام ہوگئے۔ کسی کا گھٹنا ٹوٹا، کسی کا سر پھوٹا، کسی کی پگڑی گری، کسی کی شیروانی پھٹی۔ بہرحال جو لوگ جیسے تیسے آگے نکل گئے "صاحب بہادر" نے ان کو ذیلداری کے لئے نامزد کر دیا۔

اسی زمانے میں "بے روزگاری" کے ساتھ "بے ریزگاری" بھی شروع ہوگئی یعنی "ریزگاری" کا توڑا پڑا۔ کیفیت یہ تھی کہ ایک روپے کی ریزگاری بھی نہیں ملتی تھی کہیں سے انہیں دنوں ایک "خالصہ مہاراج" نے ایک سو روپے کی ریزگاری جمع کی اور ڈاکخانہ منی آرڈر کرانے کے لئے پہنچا کلرک نے کہا —— "سردار جی! نوٹ لے آئے اب میں کہاں اس کو گننے بیٹھوں گا۔"

سردار جی نے کہا —— "ارے بھائی —— میں نوٹ ہی لاتا مگر گھر سے خط آیا ہے کہ "ریزگاری" کی بڑی تکلیف ہے اس لئے بجائے نوٹ لانے کے ریزگاری لایا ہوں تاکہ ان کی مشکل آسان ہو جائے۔"

سردار جی سمجھ رہے تھے کہ شاید منی آرڈر کے ذریعے یہی ریزگاری ان کے گھر والوں کو مل جائے گی۔ بہرحال "بے ریزگاری" اس لئے بڑھی کہ لوگ ریزگاری جمع کرتے تھے اور دبائے رکھتے تھے۔ ڈپٹی کمشنر کو جب اس کا علم ہوا تو وہ شام کے وقت عام لباس میں بازار سے نکلے۔ ایک دکاندار سے کہا —— "ایک روپے کی ریزگاری دے دو۔"

"دکاندار نے جواب دیا —— "ریزگاری" نہیں ہے ہمارے پاس!"

صاحب نے کہا —— "وہ کیا رکھی ہے؟"

دکاندار نے کہا ——" یہ دینے کے لئے نہیں ہے یہ گاہک لوگ کے لئے ہے !"

صاحب نے کہا —" اچھا تو ایک سگریٹ دے دو اور باقی پیسے دیدو۔"

دکاندار نے کہا "سگریٹ لینا ہے تو روپیہ بھنا کر لائیے۔"

دکاندار کو علم نہیں تھا کہ ضلع کا حاکم اس سے مخاطب ہے —— بہرحال ڈپٹی کمشنر صاحب یونہی بازاروں میں گھومتے رہے۔ چالیس پچاس دکانداروں نے ان کو "ریزگاری" نہ دی۔ دوسرے دن ان کا چالان ہوگیا۔ یہ خبر شہر میں پھیل گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دبی ہوئی ریزگاری باہر نکل آئی۔ ہر شخص ڈرتا تھا کہ کہیں اس کا بھی چالان نہ ہو جائے۔ بہرحال اس حکمت سے" بے ریزگاری" کی شکایت ختم ہوگئی۔

(۱۲، نومبر ۱۹۵۵ء)

گاؤں مسلمان ہو گیا

مغربی پاکستان کے سیاسی بحران کی خبریں آپ ہر روز پڑھتے ہیں ——— خصوصاً اس "شاہی دنگل" کے "خلیفہ معراج دینوں" کے بیانات کہ "اتنے ممبر ہمارے ساتھ ہیں وزارت ہماری بنے گی" ——— نہیں! یہ غلط ہے ممبروں کی بھاری اکثریت ہمارے ساتھ ہے ہم کو "کرسی" سے کوئی ہٹا نہیں سکتا۔

"اکھاڑے کے یہ خلیفہ لوگ" جس یقین اور وثوق کے ساتھ اپنی اکثریت کا دعویٰ کرتے ہیں ان کے ممبروں کی طرف سے بھی اسی یقین اور وثوق کے ساتھ حمایت کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ دونوں اکھاڑوں کے "خلیفہ لوگ" سمجھتے ہیں

کہ ہم پالا ماریں گے میدان ہمارے ہاتھ ہی رہے گا ـــــــ سردست کچھ کہنا مشکل ہے کہ کیا ہوگا۔ کیوں کہ یہ تو نتائج ہی بتائیں گے کہ کون سا دھڑا مضبوط ہے۔ ہمارے ہاں ممبریں اور بٹیریں کوئی فرق نہیں۔ اگر آپ کو بٹیر بازی کا شوق ہے تو آپ جانتے ہوں گے کہ بٹیریں بڑی مشکل سے قابو میں آتی ہیں ایک پنجرے میں ڈالئے دوسری پھدک کر باہر۔ اسے پکڑئیے تیسری پھدک کر باہر ـــــ اگر دو پنجروں میں بٹیر آپ ڈالیں تو اس پنجرے کے بٹیر اس پنجرے میں اور اس پنجرے کے بٹیر اس پنجرے میں آجائیں گے۔ اور آپ پریشان ہوں گے کہ اس گتھی کو کیسے سلجھایا جائے؟

جب دو دھڑوں میں ٹھن جاتی ہے تو بعض اوقات بڑی دلچسپ صورتحال پیدا ہوتی ہے مثلاً سندھ یعنی سابق سندھ میں ایک بار ایسا ہوا کہ "توازن کی طاقت" صرف ایک ممبر کے ہاتھ میں تھی۔ اگر ایک دھڑے کا ایک ممبر دوسرے دھڑے میں شامل ہوگیا تو سمجھ لیجئے وزارت کا تیا پانچہ ہوگیا۔ اور دوسری طرف اکثریت ہوگئی۔ پھر دوسری طرف کا ایک ممبر ادھر لڑھک گیا تو پھر وزارت کا سنگھاسن ڈول گیا اور ادھر والوں نے وزارت بنالی۔ اس زمانے میں خوب "سیاسی بلیک مارکیٹ" ہوئی اور بڑی بڑی رقمیں اور مراعات ممبروں نے حاصل کیں یعنی خوب "سیاسی رشوتیں" لیں۔ دینے والوں نے "رشوتیں" اس لئے دیں کہ اقتدار کو تو بہرحال برقرار رکھنا تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے سابق پنجاب میں "اکالی پارٹی" اور "چھوٹو رام کی جاٹ پارٹی" نے کیا خوب

مزے کئے۔ مسلم لیگی آپس میں دست وگریباں تھے اس لئے "توازن طاقت" ان پارٹیوں کے ہاتھ میں تھی۔ یہ پارٹیاں خوب "رشوتیں" لیتی تھیں اور کانگریس پارٹی کو وزارت سے الگ رکھتی تھیں۔ کبھی کبھی کانگریس والوں کا داؤں چل جاتا تھا اور وہ یونینسٹوں کے ساتھ ملکر وزارت کے حصے بخرے کرتے تھے۔

آج جو کچھ ہو رہا ہے اس میں بھی یہی "سودا بازی" اور یہی "رشوت" چل رہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک تاجر "حاضر مال" کا سودا کرتا ہے یعنی ؎

اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

اور دوسرا اگر وہ وعدے کا کاروبار کرتا ہے یعنی مال ابھی جہاز میں ہے اور جہاز سمندر میں ہے لیکن سودا ہو رہا ہے۔ "گوردھن داس مارکیٹ میں" "لیا دیا" ــــ ادھر یہ لوگ سیاسی جوڑ توڑ میں مصروف ہیں اور دوسری طرف عوام ہیں کہ بچارے مہنگائی کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں آمدنی محدود ہے ــــ خرچ زیادہ ہے۔۔۔ جب لوگ دیکھتے ہیں کہ جو لوگ ملک کے رہنما ہیں وہ "بلیک" چلاتے ہیں تو آخر انہوں نے کیا گناہ کیا ہے۔ ؟ وہ بھی کھلے بندوں اور وہ بھی رمضان شریف میں "بلیک کا دھندا" کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عوام پسے جا رہے ہیں۔

یہ عجیب سیاست ہے کہ ایک سانس میں کہا جاتا ہے!۔

"ڈاکٹر خان ملک کے مفاد کے لئے ضرور مستعفی ہوں۔"

اور اسی پشاور میں جہاں یہ بیان دیا گیا دوسرے سانس میں کہا گیا!
"ڈاکٹر خاں کو ملک کے مفاد کے لئے رہنا چاہیئے"
پھر اسی پشاور میں ایک "فصلی لیڈر نے کہا!۔
"ڈاکٹر خاں کی سیاسی زندگی کا ماضی بہت شاندار رہے
مگر آخری دور میں وہ اپنی سیاسی زندگی کو قربان کر رہے ہیں۔
آنے والا مورخ ان کے متعلق یہی لکھے گا کہ انہوں نے اقتدار کی خاطر
اپنی سیاسی زندگی قربان کر دی۔"

ان حضرت کو یہ سوچنے کی ضرورت نہیں پڑی کہ آنے والے دور کا مورّخ ان کے متعلق کیا لکھے گا؟ ——— کیا وہ یہ نہیں لکھے گا کہ یہ لوگ اقتدار کے لئے اپنے وعدوں سے پھر گئے۔ اقتدار کے لئے انہوں نے ضمیر و ایمان کی متاع بے بہا کو بر سر عام نیلام کر دیا؟ آنے والے دور کا مورّخ یہ بھی لکھ سکتا ہے کہ ایک عصمت فروش ان ضمیر فروشوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ واجب الاحترام ہے۔

ہاں تو ذکر یہاں سے چلا تھا۔ کہ اکھاڑے کے "خلیفہ لوگ" خم ٹھونک کر دعویٰ کرتے ہیں کہ اکثریت ہمارے ساتھ ہے اور ممبر بالکل بٹیر ہیں۔ کبھی ایک پنجرے میں کبھی دوسرے پنجرے میں۔ قیام پاکستان سے پہلے پنجاب میں انتخابات ہوئے تھے ان میں مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کا مقابلہ تھا۔ مسلم لیگ والے جس گاؤں میں جاتے تھے وہاں جلسہ کرتے تھے انہیں یقین دلایا جاتا

تھا کہ ووٹ مسلم لیگ کو ملیں گے۔ ہم یونینسٹوں کا ساتھ نہیں دیں گے۔ چنانچہ مسلم لیگ والے اعلان کرتے تھے کہ ۔۔۔۔۔

"گاؤں مسلمان ہو گیا ہے۔"

اس کے بعد یونینسٹوں کی "زمیندارہ پارٹی" کے لوگ گاؤں میں آتے تھے اور مسلم لیگ کے خلاف تقریریں کرتے تھے۔ ان کو بھی یقین دلایا جاتا تھا کہ ووٹ تمہارے ہیں۔ اس کے بعد یونینسٹ پارٹی والے اعلان کرتے تھے کہ!

"گاؤں مسلمان ہو گیا ہے"

اس سلسلہ میں دلچسپ بات یہ ہے کہ گاؤں کے سکھ نمبردار اور ہندو جاٹ نے بھی یونینسٹ پارٹی کی حمایت کی۔ اس پر کہا گیا۔

"سردار وریام سنگھ اور لالہ طوطا رام بھی مسلمان ہو گئے ہیں۔ اور یونینسٹ پارٹی کے ساتھ ہیں۔"

آج بھی یہی کیفیت ہے ہر روز خبریں آتی ہیں مسلم لیگ والے کہتے ہیں!

"دو سو سے زیادہ مسلمان ہو گئے ہیں۔"

ری پبلکن کا اعلان آتا ہے۔

"اکثریت مسلمان ہو گئی ہے"

اور مزے کی بات یہ ہے کہ وریام سنگھ اور طوطا رام آج بھی مسلمان ہو رہے ہیں کیوں کہ حیدرآباد کے ایک ہندو ممبر نے اعلان کیا ہے کہ وہ مسلم لیگ کا ساتھ دے گا۔

بچا موج دین تو ایسے کٹر مسلم لیگی ہیں کہ انہوں نے کہہ دیا ہے کہ سے

"ومبر لیگم مسلمانی مرا در کار نیست"

بہرحال "جمہوریت کا یہ تماشا دیکھتے جائیے۔ اقتدار کے لئے "جمہوریت" کی دہائی دی جاتی ہے اور گاؤں مسلمان ہو رہا ہے ۔" لیکن جمہور جن مصیبتوں کا شکار ہیں کوئی اللہ کا بندہ ان کو مصیبتوں سے نجات دلانے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا۔ جو لوگ جمہوریت کا نام لیکر کرسی سنبھالتے ہیں وہ اپنی کرسی کے بچاؤ کے لئے تو ہاتھ پیر مارتے ہیں لیکن عوام کو پریشانیوں سے چھٹکارا دلانے کے لئے ٹس سے مس نہیں ہوتے اور کیفیت یہ ہے کہ ہر منسٹر "سیلف ڈیفنس منسٹر" بنا ہوا ہے ۔

(۱۱ر مئی ۱۹۵۶ء)

۲۱ اپریل

ہر برس ۲۱ اپریل کو یوم اقبال منایا جاتا ہے۔ ملک کے ہر کونے کھانچے میں جلسے ہوتے ہیں جن میں ہم حکیم الامت علامہ اقبال کو خراج عقیدت و تحسین پیش کرتے ہیں۔ جہاں تک جلسوں کا تعلق ہے وہ اگر ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن یوم اقبال منانے والے اس سلسلہ میں ایک عدد مشاعرہ بھی داغ دیتے ہیں یعنی ؎

جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی

حالانکہ سب جانتے ہیں کہ علامہ اقبال مشاعروں میں شرکت نہیں کرتے

تھے بلکہ وہ مشاعروں کو سخت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے کیوں کہ مشاعروں میں ایسا کلام مقبول ہوتا ہے جس کے سننے سے بہتوں کا بھلا ہوتا ہے۔ اشعار عموماً سطحی قسم کے ہوتے ہیں اور پھر ہمارے مشاعرے ترنم کی بھرمار کے سبب زندہ ناچ گانا ہو کر رہ گئے ہیں۔ گویّے اور شاعر میں بڑی مشکل سے امتیاز ہو سکتا ہے۔

علامہ اقبال نے اپنے کلام میں تصوف کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے اور بے عمل صوفیوں کی خوب خبر لی ہے۔ آپ قوالی کو مشاعروں کی طرح "دماغی عیاشیوں" کا سامان سمجھتے تھے لیکن یار لوگ ہیں کہ "برائے ایصال ثواب" قرآن مجید ختم کرنے کے بجائے قوالی کا اہتمام بھی مشاعرہ کی طرح کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ ضروری ہے کہ کسی شخص کی برسی کے موقع پر ان باتوں کا خیال رکھا جائے کہ مرحوم کو کن چیزوں سے رغبت تھی اور کن سے نفرت۔

ہم نے دیکھا ہے کہ ایک سیٹھ جی نے زندگی بھر پھوٹی کوڑی بھی خیرات نہیں کی تھی بلکہ بلیک مارکیٹ اور سود سے اپنی تجوریاں بھرتا رہا۔ لیکن جب وہ مرا تو اس کے چالیسویں پر دیگیں چڑھائی گئیں اور فقیروں کو کھانا کھلایا گیا۔ ایک شخص نے کہا۔

"دیکھئے یہ لونڈے باپ کی کمائی کو اس راہ میں صرف کر رہے ہیں جس کا تصوّر بھی ان کے باپ کے ذہن میں نہیں آسکتا تھا۔"

تو اس پر ایک صاحب بولے کہ۔ "اگر وہ عمر بھر ایک غلطی کرتا رہا تو

اس کا یہ مطلب نہیں کہ مرنے کے بعد اس کی اولاد بھی اس غلطی کی اصلاح نہ کرے؟"

ہوسکتا ہے کہ یوم اقبال منانے والے یہ سمجھتے ہوں کہ علامہ اقبال کو اگر مشاعروں اور قوالی سے نفرت تھی تو یہ ان کی غلطی تھی۔ کیوں نہ اس غلطی کی اصلاح کی جائے۔ طول و عرض ملک میں "یوم اقبال" کے سلسلہ میں جتنے مشاعرے ہوئے ان میں جو غزلیں اور نظمیں پڑھی گئیں اگر آپ وہ سب جمع کرلیں تو دیکھیں گے کہ بمشکل دو چار نظمیں ایسی ملیں گی جن کا تعلق اقبال یا اقبال کے کلام سے ہو۔ یا وہ اصلاحی اور قومی قسم کی ہوں ورنہ ہم آج نہیں بلکہ برسوں سے یوم اقبال کے جلسوں میں ایسے کلام سنتے ہیں جو "مست قلندر" قسم کے رسالوں میں چھپتا ہے۔

یہ تو تھا حصہ "نظم" اب نثر کی طرف آئیے۔ اقبال کے کلام کو سمجھنے اور سمجھانے والے بہت کم لوگ ہیں یہ اور بات ہے کہ ہر شخص مقالہ لکھتا ہے اور تقریر بھی کرتا ہے۔ اقبال اور اقبال کے کلام کے متعلق اگر وہ کچھ نہیں کہتا تو کم از کم اپنے متعلق تو کہتا ہے اور یہ اس کا پیدائشی حق ہے۔ دو چار برس ہوئے لاہور میں "یوم اقبال" کے سلسلہ میں ایک جلسہ ہوا تھا۔ اس جلسہ میں بیگم جہاں آرا شاہنواز نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"حضرات آج میں اقبال کے متعلق کچھ ایسی باتیں کہنا چاہتی ہوں جن

کے متعلق آج تک کسی نے نہیں سوچا !"

بیگم شاہنواز نے فرمایا !

(۱) میرے (یعنی بیگم شاہنواز کے) خاندان میں اُردو ادب کا بڑا چرچا تھا اور میں بچپن سے ہی "مسدس حالی" کے اشعار پڑھا کرتی تھی۔

(۲) علامہ اقبال ہمارے گھر ڈنر کھایا کرتے تھے۔

(۳) میں نے ایک نظم کی فرمائش کی اور انہوں نے لکھ دی۔

(۴) میں اکثر پردے کے پیچھے بیٹھ کر ان سے "تتلی اور پھول" پر نظمیں سُنا کرتی تھی۔ اور حیران ہوتی تھی کہ ہمارے ملک میں دوسرا "ورڈز ورتھ" کیسے پیدا ہوگیا ؟

(۵) جب میں نے ان کا مشہور شعر ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

سنا تو میں ساری رات جاگتی رہی۔

(۶) لندن میں ایک بار کسی لارڈ نے ایک ڈنر دیا جس میں خاکسار بھی شامل ہوئی۔ یہ محفل علامہ اقبال کے اشعار سننے کی خاطر منعقد کی گئی تھی چنانچہ انگریز بھی ان کے اشعار سن کر جھومتے رہے۔

(۷) علامہ اقبال مجھے اس لئے عزیز سمجھتے تھے کہ میں ان کے ایک دوست سے منسوب ہو چکی تھی۔

(۸) لارڈ لوتھن نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ علامہ اقبال بہت بڑے آدمی ہیں

یہ تھیں وہ باتیں جو نہ کبھی کسی نے سوچیں اور نہ کبھی کسی نے بتائیں۔ میں کہتا ہوں کیوں نہ ان تقریروں اور اسی قسم کے مقالات کو بھی جمع کر کے کتابی صورت دے دی جائے۔ اگر کوئی صاحب وہ کلام جو یوم اقبال کے مشاعروں میں پڑھا جاتا ہے۔ اور وہ مقالات اور تقریریں جو اس موقع پر ہوتی ہیں مرتب کریں تو یہ کام یقیناً بہت بڑا کام ہے۔

(۱۹؍اپریل ۱۹۵۶ء)

ٹیبل ٹاک

"لڑنا جھگڑنا تو ویسے بھی نہیں چاہتے لیکن خصوصاً رمضان شریف میں تو بچنا ہی چاہئیے لڑائی سے!"

"مگر یہ مسلم لیگی آپس میں ہی کیوں گتھم گتھا ہو رہے ہیں اس مہینے میں؟"

"وہ سنا نہیں تم نے کہ بھوکا بٹیر زیادہ لڑتا ہے ——— ہمیں ان کی لڑائی سے کیا غرض ——— بس تماشا دیکھو ان کا۔"

" اجی تماشا تو ان کا کب سے دیکھ رہے ہیں —— لوگوں کو اتحاد کی تلقین
کرتے ہیں یہ —— اور خود لڑتے ہیں ۔"

" وہ سات وزیروں کو بھی تو نکال دیا ہے انہوں نے مسلم لیگ میں سے
جن میں نواب ممدوٹ جیسے " مسلم لیگی ابن مسلم لیگی " بھی شامل ہیں ۔"

جی ہاں —— اسی کا نام تو اتحاد اور تنظیم ہے ایک زمانہ میں یہ لوگ کہتے تھے

مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ

اور اب ان کا " قومی ترانہ " ہے

مسلم ہے تو مسلم لیگ سے جا

" اور نہیں دیکھا —— کہ دونوں قاضیوں میں ٹھن گئی ؟"

" کن قاضیوں میں ؟"

" قاضی عیسیٰ اور قاضی فضل اللہ میں ۔"

" وہ کیسے ؟"

"وہ یوں کہ قاضی فضل اللہ کہتا ہے کہ اخراج کا فیصلہ متفقہ طور پر نہیں ہوا اور قاضی عیسیٰ کہتا ہے کہ فیصلہ تو متفقہ طور پر ہوا ہے مگر ووٹ نہیں لئے گئے۔"

"جب ووٹ ہی نہیں لئے گئے تو پھر فیصلہ متفقہ کیسے ہوا؟"

"ارے بھائی سب چلتا ہے۔"

"مگر ان میں سچا کون ہے اور جھوٹا کون ہے؟"

"یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے ——— مگر رمضان کے مہینے میں قاضی ہی جھوٹ بولنے لگے تو ہم گناہگاروں کا کیا حشر ہوگا۔"

"میرے خیال میں قاضی فضل اللہ سچ کہتے ہیں؟"

"وہ کیسے؟"

"وہ یوں کہ ان کو مسلم لیگ کی مجلس عاملہ سے اختلاف تھا ظاہر ہے کہ

جب اختلاف تھا تو پھر فیصلہ متفقہ نہیں ہو سکتا۔"

"ہاں یہ بات بالکل ٹھیک ہے ـــــ اور سولہ آنے ٹھیک۔"

"مگر دو اور قاضیوں میں بھی تو جو تم بیزار رہے؟"

"کن میں؟"

"قاضی عیسیٰ اور قاضی موسیٰ میں ـــــ یہ دونوں ایک دوسرے سے اتنا دور رہیں جتنا "عیسیٰ خیل" (ضلع میانوالی کا ایک گاؤں) سے "لالہ موسیٰ" (ضلع گجرات کا ایک قصبہ)

"وہ کیسے؟"

"وہ یوں کہ موسیٰ کہتا ہے ڈاکٹر خان ہی کو مغربی پاکستان کا وزیر اعلیٰ رہنا چاہیئے اور ـــــ عیسیٰ کہتا ہے کہ وزیر اعلیٰ کسی مسلم لیگی کو ہونا چاہیئے۔"

"تو اس میں جھگڑے کی بات ہی کیا ہے" ـــــ وہ نہیں سنا تم نے کہ:

عیسیٰ بہ دین خود موسیٰ بہ دین خود

"مگر یہ تو دونوں بھائی ہیں اور پھر موسیٰ بڑا بھائی ہے اور بڑا بھائی باپ کی جگہ ہوتا ہے۔"

"ارے تم بڑے بھائی کو روتے ہو ـــــ یہ تو "ترقی پسندی" کا دور ہے یہاں لوگ باپ کی رائے سے متفق نہیں ہوتے۔"

"مگر قاضی عیسیٰ جو بات کہتا ہے بالکل ٹھیک کہتا ہے ـــــ واقعی اگر مسلم لیگی وزارت بنے تو اس میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔"

"کیسا فائدہ؟"

"اتنا بھی نہیں جانتے تم ـــــ میرے بھائی قاضی عیسیٰ سے بڑا کون مسلم لیگی ہے۔ اس ملک میں ـــــ اور پھر وہ "مشہور" بھی ہے اگر کایا پلٹ ہوگئی تو الٹ پلٹ میں قاضی کا بھی تو "گولڈن چانس" ہے۔"

"اب میں سمجھا ـــــ کہ یہ بات ہے اصل میں ـــــ مجھے ایک اور عیسیٰ بھی یاد آگیا۔"

"وہ کون"؟

"وہ اپنا عیسیٰ جعفر ـــــ وہ موسیٰ تو نہیں تھا کہ عیسیٰ کی مخالفت کرے اس نے ایک بار آرام باغ میں تقریر کی تھی جس میں قاضی عیسیٰ کی حمایت کی تھی یعنی ؎

عیسیٰ کو عیسیٰ ملے کر کر لمبے ہاتھ
موسیٰ خاں غریب کی کوئی نہ پوچھے بات

عیسیٰ جعفر نے کہا تھا ـــــ یہ مطالبہ بہت پرانا ہے کہ بلوچستان کو بھی صوبہ بنایا جائے مگر قاضی عیسیٰ صاحب چونکہ برازیل میں سفیر ہو گئے تھے اس لئے یہ معاملہ بیچ میں لٹک گیا ـــــ اب چونکہ قاضی عیسیٰ فارغ ہو گئے ہیں اس لئے بلوچستان کو صوبہ بنایا جائے اور اس کا گورنر قاضی عیسیٰ کو بنایا جائے"

"اور ـــــ پھر یہ مزے کی بات نہیں سنی تم نے ـــــ کہ جب "ون یونٹ" بن گیا تو قاضی عیسیٰ نے بیان دیا کہ سب سے پہلے میں نے یہ آواز اٹھائی تھی۔ اور میں ہی "بانیٔ ون یونٹ" ہوں۔"

"ارے بھائی ـــ چھوڑو ـــ اس بات کو ـــ کہہ جو دیا کہ
"سب چلتا ہے"! ـــــ اس لئے آؤ ہم بھی چلیں
"پھر ملیں گے ـــــ اگر خدا لایا" ـــــ!

(۲۶ اپریل ۵۶ء)

پان — اور — پانی

پانی پینے کے لئے ہے اور پان کھانے کے لئے
زندگی کا ساز و سامان یہی ہے۔ سگریٹ کے توڑے سے وہ لوگ پریشان ہیں جو سگریٹ پینے کے عادی ہیں۔ الحمد اللہ کہ میں اس نعمت سے محروم ہوں۔ میں پان کھاتا ہوں اور پانی پیتا ہوں ؂

پان کھاتا ہے پانی پیتا ہے
اور عاشق میں کیا برائی ہے

سگریٹ کا توڑا تھا مگر پان تمام آفات ارضی و سماوی سے محفوظ تھا

لیکن اس پر بھی آخر کار آفت نازل ہوگئی۔ کہاں وہ "دستر خوان" سائز کا پان دو پیسے میں اور کہاں پان کی "کترن" اس بھاؤ بیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ جب پان غائب ہو جاتا ہے تو پانی بھی بھاپ بنکر اُڑ جاتا ہے اور جب پانی غائب ہوتا ہے تو پان کو اغوا کر کے لے جاتا ہے۔ چنانچہ آج کل یہ دونوں چیزیں غائب ہیں اگرچہ پان کے بغیر بھی گذارہ ہو سکتا ہے لیکن زندگی میں کچھ رنگینی تو ہونی چاہیئے۔ خیر اس کو چھوڑیئے جہاں تک پانی کا تعلق ہے۔ اس گرمی میں پانی کے بغیر کوئی ذی روح زندہ نہیں رہ سکتا اور پھر اس شدید گرمی میں پانی کے بغیر کیسے زندہ رہ سکتا ہے کوئی ؟

اگرچہ نہ درختوں کے جھنڈ ہیں، نہ کھیتوں کے روح پرور منظر ہیں، نہ پرندوں کے چہچہے ہیں نہ دوشیزاؤں کے قہقہے ہیں۔ نہ مست ہوائیں ہیں۔ غرضیکہ پنگھٹ پر جو کچھ نظر آتا ہے وہ نہیں ہے پھر بھی ہر محلہ میں پنگھٹ نظر آتا ہے۔ اور علاقوں کا حال تو میں نہیں جانتا البتہ "اولڈ ٹاؤن" جہاں میں رہتا ہوں میرے سامنے ہے۔ یہ علاقہ میٹھادر سے شروع ہو کر کھارادر سے مڑتا ہے اور وہاں سے اچل سنگھ گراؤنڈ (لکڑی گراؤنڈ) سے ہوتا ہوا صرافہ بازار کی طرف آتا ہے اور صرافہ بازار سے پھر میٹھادر پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ مقام شہر سے کچھ بلندی پر ہے۔ اصل پرانا شہر یہی ہے جو سمندر کے کنارے آباد تھا۔ اس کے گرد فصیل تھی اور داخل ہونے کے لئے دروازے تھے انہیں دروازوں کی یادگار یہ دونوں دروازے ہیں جن کو میٹھادر اور کھارادر کہتے ہیں۔ ان ناموں میں جہاں شیرینی

ہے وہاں نمکینی بھی ہے۔ ارے میں تو پنگھٹ کا ذکر کر رہا تھا بیچ میں تاریخ جغرافیہ کیسے ٹپک پڑا ——— ؟ ہاں تو ہر سال گرمی کے موسم میں اولڈ ٹاؤن سے پانی غائب ہو جاتا ہے پہلے تو نل یہاں کے رہنے والوں کے حال زار پر آنسو بہاتے ہیں۔ یعنی قطرہ قطرہ پانی آتا ہے جو دریا نہیں بنتا اور اس کے بعد یہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں۔ جو نل نیچی سطح پر ہیں ان میں پانی آتا ہے اور یہی اس علاقہ کے پنگھٹ ہیں۔ ان پر پنگھٹ کی بہاریں تو نظر نہیں آتیں البتہ قطاریں ضرور نظر آتی ہیں۔

صبح کے وقت عورتیں۔ مرد۔ بچے۔ بوڑھے۔ مٹکے۔ گھڑے۔ بالٹیاں صراحیاں دیگچے۔ ڈبے۔ غرضیکہ پانی بھرنے کے لئے جو شے ملتی ہے اٹھائے ہوئے پنگھٹ پر آتے ہیں۔ یہ "محمود ایاز" مع مٹکے۔ گھڑے وغیرہ ایک ہی صف میں نظر آتے ہیں۔ یہاں نہ نقرئی قہقہے ہیں نہ رسیلے چہچہے۔ بے ہنگم آوازیں ہیں۔

"او لالہ ایک بالٹی تو بھر لیا اب دوسرے کو بھی بھرنے دیجئے۔"

"ارے کیا نل ہی اکھاڑ کر لے جائے گا۔"

"او مائی تو دیر میں آتی ہے پہلے آنے والوں کو بھرنے دے۔"

"ابے دھکا کیوں دے رہا ہے سیدھی طرح کیوں کھڑا ہو۔"

"آدمی لوگ سالا بوم مارتا ہے مُنس پالٹی سالا سنتا نہیں ہے پینے کو بھی سالا پانی نہیں ملتا۔"

پھر اس کے بعد !

"منہ سنبھال کر بات کرو۔"

"جاؤ لڑے جاؤ — ہم تمہارا جیسا بڑا دادا گیر دیکھا ہے۔"

"تم بھی رستم کا بچہ نہیں۔"

"یہ بات ہے تو آؤ۔"

ایک نے گریبان پکڑا دوسرے نے گلا پکڑا۔ ادھر سے مکا۔ ادھر سے لات۔ یعنی ؎

فاعلاتن - فاعلاتن - فاعلات

لوگ بیچ بچاؤ کرتے ہیں اور بیچ بچاؤ ہی میں اور معرکے شروع ہو جاتے ہیں۔ یعنی پانی پر "پانی پت" کی لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔ پسینہ پر خون گرانا تو سنتے تھے اگرچہ وہ دیکھا نہیں۔ لیکن پانی پر خون گرتے اور گراتے دیکھا ہے۔

یہ تو خیر ایک علاقے کے "پنگھٹوں" کی ہلکی سی جھلک ہے۔ لیکن شہر کے دوسرے علاقوں کی کیفیت اس سے بدتر ہے۔ وہاں "پانی پت" کی وہ لڑائیاں ہوتی ہیں کہ پوچھئے نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم لالوکھیت میں نہیں بلکہ کربلا کے میدان میں ہیں۔ ادھر یہ حالت ہے مگر دوسری طرف۔ درختوں کے لئے پانی پودوں کے لئے پانی — کتوں کو نہلانے کے لئے پانی — بہانے کے لئے پانی — اس قدر پانی ضائع ہوتا ہے کہ اس کا اندازہ آپ نہیں لگا سکتے اگر ہم ایک دوسرے کی ضرورت کا لحاظ رکھیں تو یہ مصیبت جو ہر برس نازل ہوتی ہے ٹل جائے۔ مخیر حضرات اور حکومت دونوں کی طرف سے علاقوں میں اگر کھارے

پانی کے کنوئیں اور پمپ وغیرہ ہی لگ جائیں تو اس سے بھی مصیبت دُور ہو سکتی ہے۔ لوگ نہانے دھونے کے لئے یہ پانی استعمال کریں اور پینے کے لئے کافی پانی بچ جائے۔

پانی ہی کے سلسلہ میں ایک اور بات بھی سنئے۔ قیام پاکستان سے پہلے شہر میں پانی کی جا بجا سبیلیں لگتی تھیں۔ اور تو اور گھوڑوں۔ گدھوں۔ اونٹوں۔ گائے بھینسوں تک کے لئے پانی پینے کے مرکز تھے۔ لیکن اب دو ایک جگہوں کے علاوہ کہیں یہ سبیلیں نظر نہیں آتیں۔ ڈینسو ہال پر کراچی کارپوریشن نے ایک سبیل لگانے کی اجازت دی تھی بٹوارے کے فوراً بعد کسی مہاجر نے نہیں بلکہ کارپوریشن کے ایک ملازم نے اس کو شربت کی دکان میں منتقل کر دیا۔ جوڑیا بازار ــــ کھوڑی گارڈن ــــ بولٹن مارکیٹ ــــ اور شہر کے دوسرے مقامات پر یہ سبیلیں اب ہوزری کی دکانوں ــــ گرما گرم پکوڑے کی دکانوں ــــ اور کیبنوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ جس طرح ریلوے نے اسٹیشن پر ٹھنڈے پانی کا انتظام حال ہی میں کیا ہے اسی طرح ہمیں بھی اور حکومت کو بھی چاہئیے کہ شدت کی گرمی میں ہم لوگوں کی بھلائی کا کام کریں۔ ہم چور بازاری میں اتنے محو ہیں کہ خدمت خلق کا تصوّر بھی ہمارے ذہن میں نہیں آ سکتا۔

(۳ر جون ۱۹۵۶ء)

رمضان۔ عید۔ اور۔ اس کے بعد!

رمضان آیا۔ گزر گیا۔ عید آئی۔ گذر گئی۔ لیکن ابھی تک یار لوگ عید ملن پارٹیاں اور "عید مشاعرے" کر رہے ہیں۔ رمضانی کا خیال ہے کہ اگر رمضان ایک مہینے تک رہا تو عید بھی ایک مہینے تک رہنی چاہیئے۔ بلکہ عید کا "چالیسواں" بھی منایا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ــــــ رمضان میں بہت سے دلچسپ واقعات دیکھے مثلاً ایک صاحب "برلب سڑک کے کنارے" دن کے وقت بالکل فری اسٹائل ہو کر شربت پی رہے تھے۔ ایک بھلے آدمی نے اعتراض کیا کہ ــــ "میاں! روزہ نہیں رکھا تو خدا کا گناہ کیا۔ اس سے ہمیں کیا واسطہ ؟ لیکن کم از کم احترام

تو کرنا چاہیئے تھا تم کو!"

میاں صاحب بولے!۔

"دیکھیئے صاحب! اگر میں نے احترام نہیں کیا تو کم از کم تم ہی کر لیتے"!

بھلے آدمی بولے!

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

میاں صاحب نے جواب دیا!

"مطلب یہ ہے کہ میں کھلے عام اگر شربت پی رہا تھا تو تم کو چاہیئے تھا "احترام" کرتے یعنی اپنی آنکھیں بند کر کے گزر جاتے اور مجھے نہ دیکھتے شربت پیتے ہوئے"۔

بعض ہوٹلوں میں یہ منظر بھی دیکھا کہ لوگوں کے اُوپر کا دھڑ تو "احترام" سے تھا لیکن ٹانگیں "احترام" سے نہیں تھیں یعنی پردہ جو لٹکایا گیا تھا وہ آدھا تھا۔ اوپر کا دھڑ باہر سے نظر نہیں آتا تھا لیکن ٹانگیں دکھائی دیتی تھیں۔ اس "احترام" یعنی پردے کا ایک قصّہ اور بھی سنئیے ——— وہ یہ کہ ایک ملباری ہوٹل والے نے جو کپڑا خریدا مہینہ بھر تو اس کو "احترام" کے طور پر استعمال کیا اور چاند رات کو راتوں رات اس سے کپڑے بنائے اور وہی کپڑے پہنکر عید کی نماز پڑھی۔ اس سے پہلے "جامہ احترام" تو سنا کرتے تھے لیکن اب "جامہ احترام" اور اور اس کے ساتھ "پاجامہ احترام" بھی دیکھ لیا۔

رمضان میں گداگروں کی ٹولیاں محلے محلے گھوم کر خیرات مانگتی تھیں۔ ان میں عورتیں مرد بچے بھی تھے۔ ایک مکان کے سامنے "عورتوں کی مسلم لیگ" الگ بیٹھی تھی اور "مردوں کی عوامی لیگ" کا مورچہ سامنے تھا۔ "مردوں کی عوامی لیگ" کے ایک گداگر نے "عورتوں کی مسلم لیگ" کی ایک بھکارن سے چھیڑ خوانی کی ـــــ نتیجہ یہ ہوا کہ "عورتوں کی مسلم لیگ" ـــــ "مردوں کی عوامی لیگ" کو ڈاکٹر خان سمجھ کر برس پڑیں۔ لوگ جمع ہوگئے اور اس گداگر کو لعنت ملامت کی جس نے بھکاری کو چھیڑا تھا۔ یہ گداگر بڑا استاد نکلا اس نے فوراً ایک بات گھڑ لی اور کہا۔!

"ارے بابا! ہم تو "مائی لوگ" کو کچھ نہیں بولا ہے ـــــ یہ "مونگ پھلی" کھاتا پڑا تھا ـــــ ہم بولا تم کو شرم نہیں آتا ہے دن کے وقت ایسا راستہ پر رمضان میں "مونگ پھلی" کھاتا ہے۔ ہم یہ بات بولا یہ "مائی" بولا ـــــ تم ہمارے ساتھ "مستی" کیا ہے" ـــــ یہ "مائی" حور پری تو نہیں ہے ہم جس کے ساتھ "مستی" کرے گا ـــــ اس لوگ کو شرم نہیں آتا ہے رمضان میں "مونگ پھلی" کھاتا ہے۔

گداگر کا تیر نشانے پر بیٹھا اور لوگ گداگر عورتوں کو لعن طعن کرنے لگے۔

ایک ملنگ بابا جو "شور ناقوس" سے سحری کے وقت لوگوں کو جگاتے تھے دن کے وقت ایک ہوٹل میں "احترام" کرتے پائے گئے۔ کسی نے پوچھا!

"ملنگ بابا۔ !تم سحری کو آدمیوں کو جگاتا ہے اور خود روزہ کھاتا ہے؟"

ملنگ بابا نے جواب دیا:۔

"سارا ٹائم تو آدمی لوگ کو جگانے میں خلاص ہو جاتا ہے اب روزہ ہم کس وقت رکھ سکتا ہے؟"

اس سلسلہ میں آواز "لاہور کے کارواں باشی" سے بھی کچھ سنئے!

اس رمضان میں ایک روزہ خور سے ملاقات ہوئی۔ دیکھا کہ ہوٹل میں بیٹھا بھنا ہوا مرغ کھا رہا ہے۔ دریافت کیا۔

"خیر باشد! روزے کیوں نہیں رکھے؟"

روزے خور نے بڑا سا منہ بنا کر جواب دیا۔

"اجی کیا عرض کروں۔ کئی روز سے بیمار ہوں۔ حکیم صاحب نے بتایا ہے کہ مرغ کھاؤ۔"

"ورنہ اس رمضان میں تمہارا جنازہ اُٹھ جائے گا لہذا اس ہوٹل میں آکر یہ زہر مار کر رہا ہوں۔"

ایک سیاسی لیڈر رمضان کی پہلی تاریخ کو جیل میں نظر بند کئے گئے۔ سحری کے وقت بعض قیدی روزہ رکھنے کے لئے بیدار ہوئے تو سیاسی لیڈر نے بڑی خوش الحانی سے یہ مصرعہ گانا شروع کر دیا! ——————

الوداع اے ماہ رمضان الوداع!

صبح لوگوں نے پوچھا۔

"حضرت ابھی تو رمضان کا آغاز ہوا ہے اور آپ اسے الوداع بھی کرنے لگے؟"

انہوں نے جواب دیا۔

"بھائی ——— اگر ابھی سے رمضان المبارک کو الوداع نہ کروں تو کیا خبر وہ خضر حیات ٹوانہ کی طرح جانے ہی کا نام نہ لے۔"

ان دنوں سابق پنجاب پر خضر حیات ٹوانہ کی حکومت تھی۔ اسی قسم کے ایک "مجاہد" کو ہم نے دیکھا کہ عید کے چاند کی خاطر کباب سیخ کی طرح کروٹیں بدل رہے تھے اور رمضان کی ۲۸ تاریخ ہی سے انہوں نے ہلال عید دیکھنے کی مہم شروع کر دی تھی۔

ہم نے پوچھا!

"حضرت آج ۲۸ تاریخ ہے آج چاند کہاں سے نظر آئے گا؟"

فرمانے لگے!

"دراصل مجھے عید کا چاند ہمیشہ ایک روز بعد میں نظر آیا کرتا ہے۔ لہٰذا اس مرتبہ ایک روز پہلے ہی سے چاند دیکھنے کی مشق کر رہا ہوں۔"

روزہ داروں کو عید کی خوشی ہونی چاہیئے۔ اس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج کل روزہ خور عید کی جو خوشی مناتے ہیں وہ روزہ داروں کو بھی نصیب نہیں ایک روزہ خور سے پوچھا۔

"میاں! تم نے تو ایک بھی روزہ نہیں رکھا۔ پھر عید کا چاند دیکھ کر اتنے خوش کیوں ہو رہے ہو؟"

روزہ خور نے جواب دیا:۔

"مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ اب میں دن کو بھی سگریٹ پی سکوں گا۔"

یقین کیجئے! ایک بھتیجے نے جو ابھی تیسری جماعت میں پڑھتا ہے اپنے چچا کو ایک عید کارڈ بھیجا ہے۔ جس پر ذیل کا شعر درج ہے۔

عید کے دن سب ملیں گے اپنے اپنے یار سے
ہم لپٹ کے روئیں گے گھر کے در و دیوار سے

کیا یہ رجحان طبع اس بات کی غمازی نہیں کرتا کہ بڑا ہو کر یہ بھتیجا مجنوں کا بھی باپ ثابت ہوگا۔ آخر ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کی ضرب المثل ایسے ہی صاحبزادوں کے لئے بنائی گئی ہے۔

(۲۳ر مئی ۱۹۵۶ء)

قومی لباس

ایک سرکاری تقریب میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ جس میں مختصر سا ہدایت نامہ بھی تھا اور وہ تھا اس تقریب میں شریک ہونے والوں کے لباس کے متعلق ۔ بڑے بڑے افسروں کے لئے ضروری تھا کہ وہ "شارٹ کوٹ" اور پتلون یا سوٹ پہن کر آئیں۔ شہری معززین کے لئے سیاہ اور سفید شیروانی کی شرط تھی۔ میں آج سے بیس برس پہلے سوٹ بوٹ سے بے نیاز ہو چکا ہوں اور پانچ برس سے شیروانی اور ٹوپی سے بھی آزاد ہو چکا ہوں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں ؟ ظاہر ہے کہ مجلس میں آداب مجلس کا لحاظ تہذیب میں شامل ہے یا تو یہ تھا کہ میں اپنے عام لباس

جیسے کرتہ۔ پاجامہ۔ چپل یا یوں کہئے کہ مجید لاہوری کہتے ہیں تقریب میں شامل ہونا تو غیر مہذب کہلاتا۔ یا شیروانی پہنتا۔ بہرحال مناسب یہی سمجھا کہ شیروانی پہنی جائے اس سے بحث نہیں کہ پرانی ہے۔ بوسیدہ ہے بہر صورت شیروانی ہے سے

ہے بوسیدہ مگر پتلون تو ہے
یہ شان قیصری ہے اور میں ہوں

یہ پہلا موقع تھا جب میں نے محسوس کیا کہ ہم آزاد ہو کر بھی آزاد نہیں ہیں اگرچہ آج سے چھ برس پہلے کی ایک تنگ اور بوسیدہ شیروانی پہنے ہوئے میں دعوت میں جا رہا تھا۔ آخر اس قسم کی پابندیاں کب ختم ہوں گی۔ آٹھ برس سے ہم آزاد ہیں۔ لیکن ابھی تک کوئی ہمارا قومی لباس نہیں بن سکا۔ بہرحال میں دعوت گاہ کے وسیع گل کدہ کے "کاروان رنگ و بو" میں کھو گیا۔ اچانک میرے سامنے سعودی عربیہ کے ایک بزرگ آئے علیک سلیک اور مزاج پُرسی کے بعد میں آگے آگے بڑھا تو دیکھا کہ ایک صاحب تہمند باندھے ہوئے کھڑے ہیں۔ یہ غالباً برما کے تھے۔ یہ صاحب اگر لاکھوں کے مجمع میں بھی ہوں تو بھی دُور سے پہچانے جائیں۔ اپنے قومی لباس کی وجوہ سے جو شخص کسی عرب کو دیکھے گا فوراً کہے گا۔ "یہ عرب ہے"۔ جو شخص انڈونیشیا کے کسی شخص کو دیکھے گا وہ اس کے قومی لباس کی وجہ سے پہچان لے گا۔ کہ وہ انڈونیشی ہے لیکن میں اس ہجوم میں تلاش کر رہا تھا کہ مجھے کوئی "پاکستانی" مل جائے (لباس کے اعتبار سے) اچانک بنگال کے ایک مولوی صاحب سامنے آگئے ان کا کھلا کرتہ اور پاجامہ دیکھ کر میں نے کہا۔

پاکستان کی اکثریت کا لباس یہی ہے

میں ان قدامت پسند لوگوں میں سے نہیں ہوں جو مغرب کی ہر چیز کو بُرا سمجھتے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ مجھے ہمیشہ کوٹ پتلون سے نفرت رہی ہے۔ اس کی وجہ شاید میری اقتصادی مجبوری ہو یا میری "قوم پرستی" بہرحال میں تو ایسے لباس کو پسند کرتا ہوں جو ایک عام آدمی کا لباس ہے۔ اگر ہمارا اُوپر کا طبقہ اس لباس کو قبول کرلے تو یقین کیجئے کہ ساری قوم "سادگی پسند" ہوجائے۔ اور اس سے بہت بڑی فضول خرچی کم ہوجائے۔ گھریلو زندگی ہو۔ دفتری ماحول ہو یا قومی اجتماع ہر جگہ ہمیں قومی لباس میں رہنا چاہیئے۔ یہ لباس کیا ہو یہ سوچنا میرا کام نہیں ہے ملت کے ہر فرد کو اس پر اظہار خیال کرنا چاہیئے۔

پاکستان کی اکثریت کا لباس وہ ہے جو آپ کے مجید لاہوری کا لباس ہے بنگال میں آپ ہر شخص کو ایک کرتہ اور ایک پاجامہ پہنے ہوئے دیکھیں گے دوسرے درجہ کی اکثریت پنجاب ہے وہاں پاجامہ کی جگہ شہروں میں شلوار اور دیہات میں تہمند نظر آتا ہے۔ رہا سرحد بلوچستان اور سندھ تو پورے کا پورا "شلوارستان" ہے۔ جہاں تک کرتہ کا تعلق ہے اس میں ہر جگہ کانٹ چھانٹ کا فرق تو ہے لیکن یہ ہر جگہ مشترک ہی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ ہمارا عمومی لباس کرتہ، پاجامہ یا شلوار تہبند ہے۔

پہلے شلوار کو لیجئے ——— شلوار بقول سید آل رضا لکھنوی "تنبوقنات"

ہے۔ انہوں نے ایک لطیفہ سنایا کہ ایک بار کوئی آغا صاحب لکھنو آئے آپ نے کسی دھوبن سے پوچھا۔

"ایک کپڑے کی دھلائی کیا لیتی ہو؟"

اس نے کہا "ایک آنہ"

آغا صاحب نے فوراً اپنی شلوار اسے دی اور کہا

"اس کو دھو کر دو!"

دھوبن نے کہا "اجی حضرت! میں نے تو کپڑے کی دھلائی کا ایک آنہ کہا تھا اس "تنبو قنات" کی دھلائی تو ایک روپے سے کم نہ ہو گی۔"

ہاں تو یہ "تنبو قنات" اس نقطۂ نگاہ سے بھی ٹھیک نہیں کہ اس پر کپڑا زیادہ صرف ہوتا ہے رہا تہبند تو اس کے باندھنے کا "سلیقہ" کسے ہے ع

یہ ہے وہ چیز کہ جس کا نہیں اُلٹا سیدھا

اب پاجامہ رہ جاتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ یہ غالب اکثریت کا لباس ہے لہٰذا اسے قبول کر لینا چاہیئے۔

مختصر یہ کہ اس خاکسار کی رائے میں "ہمارا قومی لباس" کرتہ پاجامہ ہونا چاہیئے۔ "خاص تقریبوں" پر ہم اس میں سادہ سی "جناح کیپ" کا اضافہ بھی کر سکتے ہیں۔ یہ ایسا ہو جیسے دُور سے دیکھ کر ہر کوئی کہہ سکے کہ دیکھو وہ "پاکستانی" ہے۔ ہاں تو میں ایک سرکاری تقریب کا ذکر کر رہا تھا میں نے وہ جلسہ بھی دیکھا تھا جہاں یہ حلف اٹھائے گئے تھے کہ ہم پاکستان کا بنا ہوا کپڑا پہنیں گے۔ لیکن اس ہجوم "رنگ و بو" میں کہیں اس "گھریلو صنعت" کا نام و

نشان نہیں تھا۔ ہمارے اُوپر کے طبقے کو سادہ لباس پہن کر کم از کم "ظاہری مساوات" کا ثبوت دینا چاہیئے۔ اور ہمیں فیصلہ کرنا چاہیئے کہ ہمارا "قومی لباس" کیا ہو۔؟ یہ جو صرف بڑے آدمی پہن سکتے ہیں یا یہ جو رمضانی اور بندو پہنتا ہے؟

(۲۱ر اپریل ۱۹۵۶ء)

"وَن یونٹ اسمبلی میں"

ہمارے "جونا دوست"، مسٹر جی الانا نے مغربی پاکستان اسمبلی میں بجٹ پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ

"نیا بجٹ مذاق ہے"

جہاں تک بجٹ کا تعلق ہے اس پر ہم اس لئے کوئی تبصرہ نہیں کر سکتے کہ "اقتصادیات" سے ہمیں دُور کا بھی علاقہ نہیں لیکن ایک بات ضرور کہیں گے کہ جب ہماری سیاست ہی مذاق ہو کر رہ جائے تو پھر "بجٹ" کیوں نہ مذاق ہو۔ ظاہر ہے کہ خربوزے کو خربوزہ دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے اس لئے "بُجٹ"

پر مسٹر الانا جیسے لکھے پڑھے آدمی کا یہ تبصرہ بجائے خود ایک مذاق ہے۔ اگر مسٹر الانا "حسن اتفاق" سے خود ہی یہ بجٹ پیش فرماتے ہیں تو ہمیں یقین ہے کہ اس میں ان کو ہزاروں خوبیاں نظر آئیں گی کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ اپنی خطابت اور دلائل کے زور سے دن کو رات اور رات کو دن ثابت کر سکتے ہیں۔

کاش کہ مغربی پاکستان اسمبلی کے اجلاس کے موقع پر میں لاہور میں موجود ہوتا اور اجلاس کا آنکھوں دیکھا حال سپرد قلم کر سکتا۔ کیا کیا ہنگامے ہوئے کیا کیا دلچسپیاں ہوئیں۔ دیکھا تو نہیں مگر سُنا ہے کہ جب خواتین اراکین نے حلف اٹھایا اور دستور کے مطابق انہوں نے اسمبلی کے اسپیکر سے ہاتھ ملایا تو اس پر قاضی جی کو تاؤ آگیا۔ انہوں نے کہا کہ

"شرعاً ایک عورت کا کسی نامحرم سے ہاتھ ملانا ناجائز ہے۔" اس پر ایک مولوی اور وہ بھی "اسلام الدین" "جلالی موڈ" میں آگئے اور فرمانے لگے کہ "آپ ہاتھ ملانے کو شرعاً ناجائز سمجھتے ہیں حالانکہ اسمبلی میں کسی عورت کا بے پردہ آنا بھی خلاف شرع ہے۔"

بات تو انہوں نے بالکل درست فرمائی ہے جب بے پردگی ناجائز ہے تو ہاتھ ملانا تو قطعی ناجائز ہے۔ ہمیں یاد آگیا کہ بٹوارے سے پہلے ایک بار باجی رشیدہ لطیف سابق پنجاب اسمبلی کی رکن تھیں۔ انہوں نے جب حلف اٹھایا تو ہاتھ ملانے سے انکار کر دیا اور صاف کہا کہ مسلمان عورت کی غیرت یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ وہ کسی نامحرم سے ہاتھ ملائے۔ یہ دور "اجنبی" حکمرانوں کا

تھا۔ باجی رشیدہ لطیف جیت گئیں اور کسی نے انہیں ہاتھ ملانے پر مجبور نہ کیا۔

یہ خبر پڑھ کر ہمیں ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ وہ لطیفہ یوں ہے کہ ایک بار کچھ لوگ بھنگ پی رہے تھے۔ اتفاق سے بھنگ کی کونڈی میں ایک چوہا آن گرا۔ انہوں نے چوہا نکال کر پھینک دیا۔ اور بھنگ چڑھا گئے اس پر ایک قاضی نے اعتراض کیا!۔

"اگر بھنگ میں چوہا گر جائے تو وہ حرام ہو جاتی ہے۔"

اس پر بڑی بحث ہوئی اور بحث کے بعد یہ طے ہوا کہ معاملہ کسی "اسلام الدین" کے سامنے رکھا جائے۔ اب "مولوی اسلام الدین" سے فتویٰ طلب کیا گیا—"مولوی اسلام الدین" نے کہا!۔

"ارے کمبختو! بھنگ تو ویسے بھی حرام ہے چہ جائیکہ اس میں چوہا بھی گر جائے۔"

خیر یہ تو لطیفہ تھا—ان باتوں کے باوجود خواتین اور خصوصاً بیگم طاہر آغا نے بڑے ٹھاٹھ سے اسپیکر سے ہاتھ ملایا—اور فقیرا خان جدون نے تو کمال کر دیا کہ اسپیکر کے ہاتھ ملانے سے پہلے انہوں نے مشہور بیگم سروری عرفان اللہ سے بڑھ کر ہاتھ ملایا اور "سنہری موقع" سے پورا پورا فائدہ اٹھایا—بیگم سروری عرفان اللہ نے بھی کمال کر دیا۔ کہ

فقیرا خان جدون سے تو ہاتھ ملا لیا۔ لیکن اسپیکر سے ہاتھ نہیں ملایا۔

اسی سلسلہ میں ایک اور دلچسپ خبر بھی ہے۔ وہ یہ کہ اسپیکر کی غیر حاضری میں ایک اجلاس کی صدارت محترمہ بیگم شاہنواز نے فرمائی۔ جب انہوں نے کرسی صدارت سنبھالی تو ایک رکن کی "رگ شریعت" پھڑک اٹھی۔ وہ فوراً کھڑے ہو کر فرمانے لگے کہ ____

"شریعت میں دو عورتیں ایک مرد کے برابر ہیں اس لئے کرسئ صدارت پر ایک عورت کی بجائے دو عورتوں کو بیٹھنا چاہیئے۔

بات بالکل درست تھی۔ کیوں کہ وراثت کے مسئلہ میں بھی دو بہنوں کو ایک بھائی کے برابر حصہ ملتا ہے اور اسی طرح دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی جگہ لیتی ہے۔ مگر بیگم شاہنواز بھی بڑی گھاگ ہیں انہوں نے ۳۱ "امیر شریعت" کو ڈانٹ پلائی اور کہا۔

"اسلام میں عورتوں اور مردوں کے حقوق مساوی ہیں"

اس پر حضرت امیر شریعت صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

ایک اور دلچسپ قصہ سنیئے ____ یہ نہیں معلوم کہ یہ دانستہ طور پر ہوا یا غیر دانستہ طور پر ____ بہرحال ہوا ____ سرکاری بنچوں کی طرف پنکھے زیادہ تھے ____ اور مسلم لیگ کے ممبروں کی طرف کم ____ اس پر ہمارے اخبار نویس ممبر میاں محمد شفیع نے اعتراض کیا کہ صاحب ہماری طرف

پنکھے کم ہیں ؎

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

ہم وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ وہ اس شکایت کا ازالہ فرمائیں۔ کیوں کہ مسلم لیگ والے جو "گرما گرم" تقریریں کرتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے ——— اگر انہیں بھی پنکھے مہیا کئے گئے۔ تو وہ یقیناً مسائل پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے۔

اسمبلی میں کچھ لوگوں نے ڈاکٹر خان صاحب کے ماضی کو سامنے رکھ کر انہیں ہدف طعن و تشنیع بنایا۔ انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر خان صاحب قیام پاکستان کے مخالف تھے۔

یہ درست ہے کہ بعض لوگوں نے واقعی قیام پاکستان کی مخالفت کی لیکن جب رائے عامہ نے پاکستان کی تحریک کا ساتھ دیا اور نتیجہ کے طور پر پاکستان قائم ہو گیا تو ان لوگوں نے ہتھیار ڈال دئیے۔ ان میں بہت سے لوگ مسلم لیگ میں آ گئے انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ جب ایک آزاد مسلم حکومت بن گئی تو اب اس کی مخالفت بے سود ہے۔ مسلم لیگ نے ان کی شمولیت پر کوئی اعتراض نہیں کیا ——— کہ یہ لوگ ——— مردود ——— ہیں۔

ڈاکٹر خان کی بھی یہی کیفیت ہے ——— یہ درست ہے کہ وہ

کانگریس میں تھے مگر پاکستان کے قیام کے بعد ان کی روش بدل گئی اور انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ پاکستان ہی میں انہیں رہنا ہے۔ وہ گوشہ نشین تھے مسلم لیگ والے ہی انہیں میدان سیاست میں لائے۔ نہ صرف یہ کہ لائے بلکہ ان کے رفیق کار بھی رہے۔ اس وقت ڈاکٹر خان کے ماضی کو وہ قطعاً بھول گئے تھے اب جب کہ اپنی کرسی سے محروم ہوئے تو وہ ڈاکٹر خان صاحب کے ماضی کو موضوع بحث بنا رہے ہیں —— گویا چھاج کو چھلنی طعنہ دے رہی ہے۔ اگر یہ لوگ اپنے گریبان میں منہ ڈالیں تو ان کو اپنا ماضی نظر آئے گا

- ان لوگوں نے ترکوں کے سینوں پر گولیاں چلانے کے لئے انگریز کو بھرتی دی۔
- ان لوگوں نے خطابات کے لئے لوگوں کی گردنیں کٹوائیں۔
- ان لوگوں نے انگریز کے لئے چندہ جمع کیا۔
- ان لوگوں نے انگریزوں کو "مسکہ" لگایا۔
- ان لوگوں نے آزادی کے متوالوں کو طرح طرح کے مصائب میں گرفتار کرایا۔
- ان لوگوں نے ہزاروں عصمتوں کو "صاحب لوگ" کی ہوس کا شکار بنوایا۔
- ان لوگوں نے اپنے ضمیر اور ایمان فروخت کئے۔
- ان لوگوں نے ہر وہ حرکت کی جو تہذیب، اخلاق، مذہب اور

شائستگی کے خلاف تھی۔

- ان لوگوں نے "صاحب لوگ" کے کتوں سے پیار کیا۔

زمانے کے انقلابات ہیں کہ یہ لوگ آج دوسروں کے ماضی پر تو حملہ کر رہے ہیں۔ لیکن اپنے ماضی کو نہیں دیکھتے۔

(۲۷ رمئی ۱۹۵۶ء)

باوفا قاتل عرف چیونٹیوں بھرا کباب

کسی زمانے میں تھیئٹر کی بڑی دھوم تھی۔ کبھی الفریڈ تھیٹریکل کمپنی آ رہی ہے۔ کبھی بالی والا کی پارسی وکٹوریہ تھیٹریکل کمپنی آ رہی ہے۔ نیو الفریڈ — بمبئی پارسی تھیٹر۔ جمعدار کی کمپنی۔ امپیریل کمپنی۔ الیگزنڈرا پارسی تھیٹریکل کمپنی۔ انفنسٹن تھیٹریکل کمپنی۔ جوبلی تھیئٹر۔ غرضیکہ ہزاروں کمپنیاں بنتی تھیں ٹوٹتی تھیں۔ ٹوٹتی تھیں بنتی تھیں ذخیرہ عشرت اندر سبھا۔ شیریں فرہاد۔ لیلیٰ مجنوں۔ شریمتی منجری۔ جلسۂ پرستان عرف بزم سلیمان۔ زہری سانپ۔ علی بابا چالیس چور۔ دودھاری تلوار، خواب ہستی۔ درد جگر۔ محبت کا پھول۔ صید ہوس۔ ہیر رانجھا۔ شہید ناز۔ آنکھ کا نشہ۔ گل بکاؤلی۔ جیسے ڈراموں

کے چرچے تھے۔

ماسٹر رحمت سے لیکر آغا حشر کاشمیری کا طوطی بول رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ نوٹنکی۔ سنگیت۔ جنگ نامہ۔ بھانڈوں کی نقل۔ کٹھ پتلیوں کا تماشہ۔ رام لیلا کا بھی خاصا چرچا تھا۔

توفیق کس حال میں ہے؟ (صدر کراچی مسلم لیگ نہ سمجھ لیجیئے گا)

"شیر لوہے کے جال میں ہے"!

"چمن خان کہاں گیا؟"

"گلشن خان کی دعوت میں!"

"اور لطافت؟"

"سوسن کدھر گئی؟"

"اپنے گھر گئی!"

"اور زلفن؟"

"کل مرگئی!"

"آرررر اچھا پان بنالاؤ!"

"پاندان کی چابی زلفن کے پاس رہ گئی!"

★

"بی صاحبہ آپ کا نام؟"

"آدھنی جان"

اوہو "آدھنّی جان اکنّی جان کی نور نظر"؟

"جی ہاں بندہ پرور اکنّی جان کی جان جگر چونّی بیگ کی جائی اٹھنّی جان کی نگائی۔ اشرفی خان کی پالی اور روپیہ خان کی سالی"!

"تو یوں کہو کہ گھر کا گھر ہی ہے ٹیکسالی"!

"جی ہاں جنابِ عالی"!

"مگر آپ کی امّی جان تو کچھ اور ہی پیشہ کرتی ہیں"؟

"جی ہاں وہ اور چیزیں بیچا کرتی تھیں"!

"کیا چٹنی، مربّہ اچار"!

نہیں سرکار جیب کترنے کی قینچی اور گلا کاٹنے کی تلوار"!

★

"چمپت سنگھ غائب غلّہ آدھا تیتر آدھا بٹیر"!

"یہ بھی تیری سمجھ کا ہے پھیر"!

"مگر آپ کی ذات ہندو ہے یا مسلمان"؟

"آدھا ہندو آدھا مسلمان۔ دن کو یہودی اور رات کو کرسٹان

"آدھا قبرستان آدھا شمستان"!

"اور میاں مذہب"؟

"مذہب؟ مذہب، رکابیا"!

"ذرا رکابیا مذہب کے عقیدے تو بیان کیجئے"!

"پہلا عقیدہ" لاپلیٹ۔ دوسرا ابھر پلیٹ۔ تیسرا جلد سمیٹ۔ چوتھا کربعینٹ

پانچواں بن سیٹھ چھٹا آرام سے لیٹ!

بس اس قسم کے مکالمے لوگوں کو ازبر تھے۔ گفتگو میں ہی تھیٹریکل زبان بولی جاتی تھی آج کے فلمی گانوں کی طرح ان دنوں تھیٹر کے گانے گائے جاتے تھے:-

لیلیٰ لیلیٰ پکاروں میں بن میں
لیلیٰ پیاری بسی مورے من میں

★

راجہ ہوں میں قوم کا اندر میرا نام

★

جوگی کا ہرن ہم نے لیا یار کی خاطر

★

کتاب دیکھ چکی اب ذرا ادھر دیکھو

★

یا الٰہی مٹ نہ جائے دردِ دل

★

لیا تھا جب دل کیا تھا وعدہ کہ روز تم سے ملا کرینگے
کبھی جو ملنا خطا کریں گے تو اس کا بدلہ ادا کرینگے

★

ہم دم بنے گا کس کا جب میرا دم نہ ہو گا
رستہ وہی چلوں گا جو سیدھا ہے صاف ہے

*

ترچھی نظر کے تیر رے ہو راجہ !

تھیٹر کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اور تو اور سرسید احمد خان نے علی گڈھ کی نمائش میں چندے کی فراہمی کے لئے ڈرامہ کر ڈالا ـــــ اور قوم کو غیرت دلائی ـــــ مگر دیکھتے ہی دیکھتے یہ میلہ بچھڑ گیا۔ یہ محفلیں ویران ہوگئیں۔ یہ بستیاں اُجڑ گئیں۔ تھیٹر کی جگہ خاموش فلموں نے لی اور خاموش فلموں کو ـــــ بولتی گاتی ناچتی تھرکتی" ـــــ فلموں نے ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا اور بولنے والی فلموں میں ترقی ہوئی۔ اب ہم" تھری ڈی" ـــــ ٹکنیکلر ـــــ اور "سینما اسکوپ" کے دَور میں ہیں۔ بہر صورت زمانے کے انقلابات کے ساتھ زمانے کا رنگ بھی بدلتا ہے۔ لوگوں کا مذاق بھی بدلتا ہے۔ اگرچہ پُرانے دور کے لوگ اس مذاق کو بد مذاقی کہتے ہیں۔ تبدیلی ہو کر رہتی ہے ۔

قدرت پر ناک بھوں چڑھانا اسلئے درست نہیں کہ جہاں اس میں برائیاں تھیں وہاں اچھائیاں بھی تھیں۔ تھیٹر ہی کو لیجیے۔ اس سے ہم کتنا کام لے سکتے تھے۔ آج بھی سمندر پار کے ملکوں میں تھیٹر قائم ہے عوامی تھیٹر بھی اور قومی تھیٹر بھی اور ان سے معاشرے کی اصلاح اور قوم کی تعمیر کے سلسلے میں بڑا

کام لیا جاتا ہے۔ ہم بڑی مدت سے سوچ رہے تھے کہ ہمارے ہاں تھیٹر ضرور قائم ہونا چاہیئے۔ اس کا یوں مٹ جانا بہت افسوسناک ہے۔ خدا بھلا کرے سندھ والوں کا انھوں نے اس فن کو زندہ کر دیا ہے۔ خصوصاً حضرت پیر علی محمد راشدی کی تو تعریف نہیں ہو سکتی جن میں بہت سی" تخلیقی صلاحیتں" ہیں آپ دیکھ رہے ہیں کہ ڈرامہ کتنی دلچسپی سے دیکھتا

کردار کتنی محنت سے کام کر رہے ہیں۔ مکالمے کتنے درست اور چست ہیں۔ سندھ کی سیاست نے جو ڈرامائی انداز اختیار کیا ہے اس نے پرانے دور کے تھیئٹر کو بھی مات کر دیا ہے:

—— رمضانی نے مجھ سے پوچھا کہ :۔

" بابو جی ! سندھ کی سیاست کے اس ڈرامے کا کیا نام جس کا" کھڑکی توڑ" ہفتہ چل رہا ہے"؟ میں نے کہا :۔

اس ڈرامے کا نام ہے :۔

"باوفا قاتل عرف چیونٹیوں بھرا کباب ——"

(۲۶۔ مارچ ۱۹۵۵ء)

کراچی کا موسم

جب کبھی گفتگو کا کوئی موضوع نہ ہو موسم ہی ایک ایسا موضوع ہے۔ جس پر بے تکلف اظہار خیال ہو سکتا ہے۔

"کہیئے مزاج تو اچھے ہیں آپ کے"؟

- "نوازش حضور کی"!
- "بھائی آج تو بلا کی گرمی ہے"!
- "ارے کچھ نہ پوچھئے صبح سے دس آٹھ کو کا کولا، پی چکا ہوں"۔
- "مگر گرمیوں میں تو گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے"۔

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ سردیوں میں" اورنج اسکویش" گرمی پہنچاتا ہے۔ بات موسم کی ہوتی ہے۔ مگر خبر آتی ہے: چرچل نے آئزن ہاور سے ملاقات کی دیر تک حالات حاضرہ پر تبادلہ خیالات ہوا۔ سیاسی حلقوں کی قیاس آرائیاں یہ ہیں کہ حالات بہت جلد پلٹا کھانے والے ہیں!

پندرہ برس پہلے کی بات ہے کہ ضلع سرگودھا کے ایک بڑے زمیندار نے جو مسکہ پالش" کے فن کے" ماہر القادری" تھے اور عموماً حکام کو پر" تکلف پارٹیاں دے کر اپنی کتاب میں اسناد لکھواتے تھے ایک انگریز ڈپٹی کمشنر کی آمد پر دھوم دھام کی دعوت دی۔ دعوت کے بعد انھوں نے" صاحب بہادر" کی خدمت میں وہ کتاب پیش کی جس پر حکام نے زمیندار کا" حق نمک" ادا کیا تھا ——

"صاحب بہادر" نے کہا۔

"کیا لکھوں اس کتاب پر"؟

" زمیندار نے ہنس کر کہا —— "حضور جو جی میں آئے"!

" صاحب بہادر نے کہا —— " لکھ دوں کہ پلاؤ بہت اچھا پکایا ہے تم نے"؟

زمیندار بولا —— "حضور جو مزاج میں آئے لکھ دیجئے۔

صاحب بہادر نے لکھا:۔

"موسم بڑا خوشگوار ہے: اور میں اس کا لطف اٹھا رہا ہوں"۔

یہ تحریر آج بھی زمیندار کے پاس محفوظ ہے اور وہ اُسے اپنا قابل فخر

کارنامہ سمجھتا ہے۔ دیکھ لیجئے۔ موسم کی بات ایک تاریخی یادگار بن گئی ہے۔

میں آج موسم کی بات ہی کروں گا۔ کراچی کے موسم کا تو بعد کو ذکر آئیگا مگر پہلے اور مقامات کے موسم کا حال سُن لیجئے۔

- سندھ کا موسم تو آپ جانتے ہیں کہ آج کل بڑا گرم ہو رہا ہے؛ اور "پارۂ حرارت چڑھ رہا ہے"
- پنجاب کا موسم کچھ "سپاٹ جا رہا ہے۔
- مشرقی پاکستان کا موسم کچھ "ملا جلا" ہے یعنی" جگنو قسم کا کبھی گرمی محسوس ہوتی ہے کبھی سردی۔ مگر موسم کی کیفیت کچھ یوں ہے" جیسے دھوپ میں بارش ہو رہی ہو۔
- بہاولپور کا موسم بالکل ٹھیک ہے یعنی" فرنٹ پر سب اچھا ہے"!
- سرحد کا موسم اگرچہ خوشگوار ہے" لیکن کچھ" ناخوشگوار ہوائیں" بھی آ رہی ہیں مگر موسم کے چینجروں کی پیشگوئی ہے کہ موسم ٹھیک ہو جائے گا۔
- بلوچستان میں موسم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ابھی تک یہ" سرزمین بے آئین" ہے۔ مگر جب" ایک یونٹ" کی ہوائیں چلیں گی۔ تو انشاءاللہ موسم ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ اگرچہ بعض لوگوں کو خدشہ ہے کہ" وحدت کی ہوائیں" جب چلیں گی تو ان کو نزلہ زکام کھانسی کا شکار ہونا پڑے گا۔ ان لوگوں کو "کوالیفائڈ" ڈاکٹروں سے رجوع کرنا چاہیئے۔

اب رہی کراچی کے موسم کی بات تو آپ جانتے ہیں کہ یہاں تمام موسم ایک ساتھ چلتے ہیں صرف بارش کا موسم ایسا ہے جس میں مہاجرین کو احساس ہوتا ہے کہ ان کی آبادی نہیں ہوئی اور حکومت انہیں تسلّی دیتی ہے اور "وعدۂ فردا کی جنتوں" میں ان کی آبادکاری کر دیتی ہے۔ اس موسم کے علاوہ کراچی کا موسم بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ معشوق کے مزاج اور سندھ کی سیاست کی طرح یہ گھڑی میں تولہ ہے گھڑی میں ماشہ -!

کہنے کو تو مارچ کا مہینہ بہار کا موسم کہلاتا ہے مگر کچھ دنوں سے کراچی میں گرمی کی سرگرمی شروع ہوگئی ہے یعنی مئی جون پیشگی ہی تشریف لے آئے ہیں۔ ابھی کل تک لحاف اوڑھے جا رہے تھے مگر اب جی چاہتا ہے کہ کپڑے پھاڑ کر منگھا پیر کا رُخ کیا جائے بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ جس طرح گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے اسی طرح گرمیوں میں منگھا پیر کے چشمے کا گرم پانی بھی ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ تجربہ شرط ہے۔

ادھر گرمی نے "ایڈوانس" دھاوا بول دیا ہے اور ادھر برف والوں کی چاندی ہوگئی ہے۔ ایک آنے کی برف منگوائیے اور ایک گلاس پانی ٹھنڈا کریئے اگرچہ فیکٹری والے اعلان کرتے ہیں ایک آنے پونڈ برف ملے گی مگر ایک آنے میں ہم کو تو دو تولہ ہی برف ملی۔ ابھی رمضان شریف نہیں آیا۔ اگر ابتدا یہ ہے۔ تو خدا جانے رمضان شریف میں حشر کیا ہوگا۔ اگر کارخانے والوں" ایکا" کرکے

برف کا مصنوعی " توڑا " کر دیا تو پھر دیکھئے گا کیا حشر ہوتا ہے۔

برف کا اصل " سیزن " تو رمضان شریف ہے۔ غریب سے غریب آدمی بھی افطار کے وقت شربت کا گلاس پیتا ہے۔ پچھلے رمضان میں مولوی گلشیر خان کے ایک دوست نے برف کی خوب بلیک مارکٹ کی۔ اللہ کے کرم وفضل سے اس نے حج کے مصارف جمع کرلئے اور پھر وہ :-

" اللّٰھُمَّ بلیک "

کا ورد کرتا ہوا گیا اور دیکھتے دیکھتے حاجی صبغۃ اللہ بنکر آگیا۔ اب حاجی صبغۃ اللہ کا ارادہ ہے کہ رمضان شریف آرہا ہے وہ پھر " سیزن " لگائے گا اور " ڈبل حاجی " بن جائے گا۔

ہم برف پر کنٹرول کا مطالبہ اس لئے نہیں کرتے کہ کہیں برف بھی انڈوں کی طرح مارکیٹ سے غائب نہ ہو جائے مگر ان لوگوں سے جو مہنگائی کے ذمہ دار ہیں اتنا ضرور عرض کرتے ہیں کہ خلقِ خدا کو تنگ کرکے جہنم کا ایندھن نہ جمع کیجیے۔ جائز منافع سے آپ کو کوئی نہیں روک سکتا۔ مگر رمضانیوں کو یوں لوٹنا، مذہب اخلاق اور شرافت سے گری ہوئی بات ہے۔

ہاں تو ـــــ کراچی کا موسم آج کل " ایڈوانس " ہی گرم ہے۔ ابھی اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست، آئے گا ـــــ دیکھیئے کیا کیفیت ہوتی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وفاقی دارالحکومت کا قانون ختم ہونے سے کراچی شہر پھر سندھ کا حصہ بن گیا ہے اسلئے اس پر سندھ کی "گرمی" کی سرگرمی اثر انداز ہوتی ہے اور یہی سبب ہے کہ کراچی میں" ایڈوانس گرمی" شروع ہوگئی ہے۔

(۲۷۔ مارچ ۱۹۵۵ء)

اقبال کے ساتھ مذاق!

یار لوگوں نے سرکار دَولت مدار کی دولت کے صدقے میں اقبال اکیڈمی کے نام سے ادارہ قائم کر رکھا ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ اس ادارے نے اپنے قیام سے تادم تحریر کیا کیا ہے۔ البتہ اس کے حسابات سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکار دَولت مدار کی دی ہوئی دولت کا بہت بڑا حصّہ یار لوگوں کے "نان نفقہ" کے کام آتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس ادارہ نے علمی اور تحقیقی کام بھی کیا ہو لیکن وہ کام خواص کی حدود سے آگے نہیں بڑھ سکا، جہاں تک عوام کو تعلیمات سے روشناس کرانے کا تعلق ہے ہم ڈنکے کی چوٹ

کہتے ہیں کہ اس ادارے نے عوام کو تعلیمات اقبال سے مطلق روشناس نہیں کرایا چند افسر لوگ مل بیٹھتے ہیں. مقالے پڑھتے ہیں. بحث کرتے ہیں اور اس کو بہت بڑی علمی خدمت کا نام دیا جاتا ہے.

---

۲۱ اپریل کو ملک کے طول و عرض میں اقبالؒ کی یاد منائی جائے گی. فاتحہ خوانی ہوگی. جلسے ہوں گے. تقریریں ہونگی اور حضرت حکیم الامتؒ کے حضور خراج عقیدت پیش کیا جائے گا. اس ادارہ کا تعلق بھی چونکہ علامہ اقبالؒ کے نام سے ہے. اس لئے یہ ادارہ جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کے مرکز میں اقبالؒ کی یاد منا رہا ہے. لیکن آپ پوچھیں گے کہا؟ —— جہانگیر پارک میں؟ —— نہیں —— آرام باغ میں —— آرام باغ میں بھی نہیں —— کسی پبلک ہال میں —— نہیں صاحب —— ان عوامی جگہوں میں نہیں —— اور عوام کے لئے نہیں —— بلکہ کراچی کے ایک "رنگ محل نما" ہوٹل میں —— جو رقص و سرود اور عیش و عشرت کے لئے مشہور ہے اس ہوٹل میں خواص کے محدود حلقہ میں اقبال کا فلسفۂ خودی پیش کیا جائے گا اور کہا جائیگا کہ اقبالؒ

مردِ قلندر تھا —— اقبال درویش تھا —— اقبال خدامست تھا. اقبال سماجی اونچ نیچ کے خلاف تھا. یہ سب کچھ اس طبقے کے سامنے ہو گا جس پر اقبالؒ نے طنز کی تھی کہ ؎

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی

اقبال کے فلسفۂ خودی کی وضاحت وہ لوگ کریں گے۔ جو اپنے "صاحب لوگ" کے سامنے جاتے ہیں تو ان کی خودی "شاندار پسپائی" کے بعد پلٹ آتی ہے۔ اللہ اللہ —— اس سے بڑا مذاق اقبالؒ کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے کہ اس کی یاد کو وہاں محدود کر دیا جائے۔ جہاں شب و روز وظیفہ ہے۔

طاؤس و رباب اوّل　　　　طاؤس و رباب آخر

اس سے پہلے بھی آپ کو یاد ہوگا کہ اس کراچی میں عوامی طور پر یوم اقبالؒ منایا جاتا تھا —— جلسے ہوتے تھے —— جن میں ہمارے رہنما ہمارے علماء —— ہمارے شاعر —— ہمارے ادیب —— ہمارے عوام سبھی شریک ہوتے تھے اور مشرق کے اس عظیم شاعر کو شایان شان خراج تحسین پیش کرتے تھے مگر چند برس سے کچھ ایسا پیچ آپڑا ہے کہ ہم نام تو جمہوریت کا لیتے ہیں مگر عملی طور پر جمہوریت سے بد لتے ہیں اس ذہنی تبدیلی کا یہ اثر ہے کہ ہم نے اقبالؒ جیسے عظیم شاعر کی یاد کو "رنگ محل نما ہوٹل" کی چار دیواری بلکہ اس کے ایک ہال تک محدود کر دیا ہے۔

وہ مردِ قلندر جو —— "ناخوش و بیزار تھا مرمر کی سلوں سے" —— اور جو کہتا تھا کہ "میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو" —— اگر آج زندہ ہوتا تو اس مذاق کی تاب نہ لا سکتا اور حرکت قلب بند ہونے سے اس کی موت واقع ہو جاتی —— میں سوچتا ہوں —— کہ اقبال کتنا

مظلوم ہے؟ ـــــ اقبال کہتا تھا ـــــ قرآن اس دور میں سب سے مظلوم ہے ـــ کوئی پوچھتا تھا ـــ حضرت کیوں؟ ـــــ تو وہ کہتا تھا ـــــ جو ایرا غیرا نتھو خیرا اٹھتا ہے۔ دو چار ترجمے سامنے رکھ کر قرآن کی تفسیر لکھ ڈالتا ہے. مگر اسے کیا معلوم تھا کہ وہ خود بھی ظلم کا شکار ہو جائے گا. اور جو لوگ اس کے کلام کی روح کو نہیں سمجھتے وہ لوگ اس پر تقریریں کریں گے" اور رنگ محل نما" ہوٹل میں کریں گے. کیونکہ آج کا دور یہ ہے کہ ؎

رہ گیا اب ڈنر تک ساری تقریروں کا زور
قوم ہے ہوٹل سے باہر" لیڈری" ہوٹل میں ہے

ہمارے ریڈیو نے اقبال رح کو قوالیوں میں ڈھال کر اس کے کلام کی وہ درگت بنائی ہے کہ داغ کے کلام کی رنڈیوں اور بھڑووں کے ہاتھوں کیا بنی ہوگی. رہی سہی کسر کو یار لوگ پورا کریں گے اور انشاء اللہ وہ دن آئے گا جب" شمشیر و سناں" کے ذکر کو خلاف تہذیب سمجھ کر طاق پر رکھ دیا جائے گا ـــــ اور کہا جائے گا اقبال رح" طاؤس و رباب" کا شاعر تھا۔ اقبال رح نے عوام کے دکھوں کا جو ذکر کیا ہے۔ اس کو الگ کر دیا جائے گا کہ ؎

شب وصال ہے گل کر دو سب چراغوں کو
خوشی کے کام میں کیا کام جلنے والوں کو

اور شاید یار لوگوں کو یہ بھی ناگوار گذرے کہ اقبال رح طبقاتی تقسیم کے کیوں خلاف ہے اور سماجی عدل کیوں چاہتا ہے؟ ـــــ اور اس کے پیش نظر

اقبال کے کلام میں یار لوگ تصرف کریں کیونکہ ؎

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امراء کے درو دیوار ہلا دو

قسم کی چیزیں تو "رنگ محل" نما ماحول میں نہیں پڑھی جا سکتی۔ البتہ وہاں یہ کہا جا سکتا ہے ؎

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو لٹا دو
کاخ امراء کے درو دیوار سجا دو

اگر یہ لوگ سرکار دولت مدار قوم کی دولت وصول کر کے اقبالؒ کی روح کے ساتھ تو مذاق کرتے ہیں تو انہیں کرنے دیجئے۔ اس مذاق کا جواب صرف یہ ہے کہ قوم بلکہ تمام پارٹیاں مل کر ایک عام جلسہ کریں۔ اور ثابت کریں کہ اقبالؒ رنگ محلوں کا شاعر نہیں تھا —— تیرہ و تاریک جھونپڑیوں کا شاعر تھا اور اس کا پیغام یہ تھا ؎

خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

اس کا پیغام یہ تھا :-

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے
خراج کی جو ہو محتاج قیصری کیا ہے
خوش آ گئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ رمضانی آ گیا کہنے لگا —— "کیا لکھ رہے ہو

بابو"؛ میں نے اسے بتایا کہ رمضانیوں کے اقبال کو یار لوگوں نے ٹیوب جی ٹائر جی کا اقبال بنا دیا ہے —— رمضانی نے کہا —— بابو جی ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی یہ لوگ جن کا تعلق نہ اقبال کے کلام سے ہے نہ پیغام سے ہے۔ آخر کیوں یوم اقبال مناتے ہیں ؟ —— میں نے رمضانی سے کہا۔ "یہ "فیشن" کے طور پر یوم اقبال مناتے ہیں۔ جس طرح آجکل انگریزی دان طبقہ فیشن کے طور پر اسلام کا نام لیتا ہے۔ اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا۔ دو انگریزی پڑھے لکھے اسلام کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں قرآن کا ذکر آیا۔ ایک نے دوسرے سے کہا۔ تم نے کونسا قرآن پڑھا ہے؟ اس نے جواب دیا —— میں نے عبداللہ یوسف علی کا قرآن پڑھا ہے"۔ دوسرے نے پوچھا —— " اور تم نے کونسا قرآن پڑھا ہے؟ پہلے نے جواب دیا —— "بھائی! میں نے مولانا محمد علی کا قرآن پڑھا ہے"۔

بات دراصل میں یہ تھی کہ انھوں نے قرآن مجید کے انگریزی ترجمے پڑھے تھے جن کو یہ —— علامہ عبداللہ یوسف علی اور مولانا محمد علی کا قرآن کہہ رہے تھے۔

(۱۸۔ اپریل ۵۷ء)

صرف غریبوں کی بھلائی کیلئے

حکومت سے روئے سخن ہوتو روسیاہ ـــــ "اپوزیشن" سے مخاطب ہوتو "مردود" سرمایہ داروں سے سبھی کچھ نہیں کہتا۔ اور نہ کسی طبقے کو ان کے خلاف "ایکسپلائٹ" کرنا چاہتا ہوں۔ میں بھڑکا نا بھی کہہ سکتا ہوں۔ مگر "ایکسپلائٹ" اسلئے کہتا ہوں۔ کہ "کامن ویلیتھ" کی یہی زبان ہے۔ اُردو اسلئے بولتا ہوں کہ یہ عملی طور پر نہ سہی "زبانی طور پر" تو ایک "قومی زبان" قرار پا چکی ہے۔ انگریزی سے اسلئے محبت ہے۔ کہ ابھی "کامن ویلیتھ" سے ناطہ نہیں ٹوٹا۔ میں "کامن ویلیتھ" کی بات نہیں

کروں گا کیونکہ "ویلتھ" سے مجھے دلچسپی نہیں ہے"۔ "کامن مین کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ وہ "کامن مین" جو باوجود "جینٹل" ہونے کے "جینٹلمین نہیں ہے"۔ "کامن مین کے متعلق اس غلط فہمی میں نہ رہیئے کہ وہ "ٹرومین" کا بھائی ہے۔ "ٹرومین" بڑا آدمی ہے اور "کامن مین" چھوٹا۔ بہت ہی چھوٹا۔ ایک ہاتھی ہے۔ دوسرا چیونٹی —— ایک پربت ہے ایک رائی۔ چیونٹی کی خودی بیدار ہو جائے تو ہاتھی چیونٹی بنے اور چیونٹی ہاتھی۔ رائی اگر اپنی حقیقت سمجھنے لگے۔ تو رائی پربت ہے اور پربت رائی —— اور رائی حقیر چیز نہیں۔ اسلئے کروڑ گنا حقیر چیز جب بیدار ہوتی ہے تو "ایٹم بم" بنتی ہے۔

ہاں تو میں "کامن مین" کا ذکر کرتا ہوں۔ مجھے "ٹرومین" سے کوئی دلچسپی نہیں۔ "کامن مین" کون ہے؟ —— رمضانی۔!

میرا رمضانی جو "قصرِ سلطانی" کی گنبد پر نہیں "صوفی جی" پنواڑی کی دکان کے سامنے "فٹ پاتھ" پر پڑے تختے۔ بنچ پر بیٹھ کر "اصلی چاند تارا چھاپ" بیڑی پیتا ہے اور ایک لمبا کش لگانے کے بعد چاند تاروں کی دنیا میں کھو جاتا ہے۔ بیڑی بجھ جاتی ہے۔ پھر سلگاتا ہے۔ پھر کش لگاتا ہے اور پھر گہری سوچ میں پڑ جاتا ہے۔ بیڑی پھر بجھ جاتی ہے وہ اسے پھر سلگاتا ہے۔ پھر وہ بندو سے باتیں کرتا ہے۔ طویل باتیں۔ باتیں ہی باتیں۔ اور بار بار بیڑی بجھتی ہے۔ بار بار اسے سلگاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سردیوں کی پہاڑ ایسی راتیں اگر نہ کٹتی ہوں تو تین آنے کا "اصلی چاند تارا چھاپ" بیڑی کا

بنڈل اور ایک ماچس خرید لیجئے۔ بیڑی سلگا کے کش لگایئے اور پھر سوچئے رات کٹ جائے گی۔

اے ہجر کی رات کاٹنے والو! تمہیں اس راز کی خبر نہ ہوئی کاش تم بھی "اصلی چاند تارا چھاپ" بیڑی پیتے۔

میرا "کامن مین" ـــــ میرا رمضانی! کبھی کبھی سوچتا ہے یہ درست ہے کہ وہ "ٹرومین" یا "آئزن ہاور" کی سطح پر نہیں سوچ سکتا۔ وہ "صوفی جی" کی "ہئیر کٹنگ سیلون" اور "حاجی عبد الغنی کی پان شاپ" کے سامنے فٹ پاتھ پر پڑے ہوئے بنچ پر بیٹھ کر سوچتا ہے۔ یہی وہ انتہائی بلند سطح ہے جہاں وہ سوچ سکتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ جو بھی آتا ہے یہی کہتا ہے کہ ہم غریبوں کی زندگی کا معیار بلند کرنا چاہتے ہیں۔ غریب کو اصلی چاند تارا چھاپ" بیڑی کی جگہ سگار پلانا چاہتے ہیں۔ ۵۵۵ پلانا چاہتے ہیں "گولڈ فلیک" پلانا چاہتے ہیں لیکن غریب بیڑی پیتا ہے۔ صبح بیت الخلاء میں بیڑی پینا شروع کرتا ہے اور رات بستر پر سوتے وقت بھی بیڑی پیتا ہے۔

ٹھنڈی آہ بھر کر سو جاتا ہے اور پھر خواب میں "قصر سلطانی" کے گنبد پر بیٹھتا ہے۔ داد عیش دیتا ہے۔ وہاں پہنچتا ہے جہاں جاگتے ہیں اس کا تصور بھی نہیں پہنچ سکتا۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ سوتا رہے "تا حشر سوتا رہے"۔ اور یہ خواب دیکھتا رہے۔ یہ خواب حقیقت نہ بن سکیں تو خواب ابو بن جائیں جب وہ جاگتا ہے تو یہی خوابوں کی باتیں سنتا ہے۔ تقریروں میں، بیانوں

میں، جلسوں میں جلوسوں میں ـــ! اور یہی "ساحری" اسے پھر سلا دیتی ہے

حکومت کہتی ہے ہم غریبوں کی بھلائی اور عوام کی خوش حالی چاہتے ہیں۔ حکومت غریبوں کے لئے ہے۔ ملک غریبوں کے لئے ہے۔ وزیر دورے کرتے ہیں۔ جلسوں میں تقریریں کرتے ہیں۔ بیان دیتے ہیں۔ پارٹیوں میں بیان دیتے ہیں۔ پارٹیوں میں جاتے ہیں "اسکیمیں" بناتے ہیں۔ صرف عوام کی بھلائی اور خوش حالی کے لئے ـــ! صرف غریبوں کی بہبودی کے لئے اور حکومت کی مخالف جماعتوں کے لوگ حکومت پر الزام لگاتے ہیں کہ اس نے غریبوں کے لئے کچھ نہیں کیا "اعلیٰ پیمانے پر" آبادکاری ہو رہی ہے جو "مِل" کی چمنیوں" اور "فیکٹریوں" کی بلندیوں سے نیچے نہیں آتی۔ پس "ہمیں ووٹ دو" "ہمیں ممبر بناؤ تاکہ ہم "وزارت" بنائیں" صرف عوام کی بھلائی اور غریبوں کی خوش حالی کے لئے "!

جن کے ہاتھ میں اقتدار ہے وہ اقتدار کو ہاتھ سے دینا نہیں چاہتے "صرف غریبوں کی بھلائی کے لئے" مزدوروں۔ اور کسانوں کے نام پر حکومت ہو یا جمہوریت کے نام پر اقتدار۔ فسطائیت ہو یا اشتراکیت۔ آمریت ہو یا شہنشاہیت۔ سب "غریبوں کی بھلائی کے لئے" ہے۔ جو بھی آتا ہے یہی کہتا ہے کہ ہم غریبوں کا معیارِ زندگی بلند کرنا چاہتے ہیں۔ غریب منافی سوچتا ہے۔ کہ غریبوں کے نام پر لوگ "قصرِ سلطانی" کے گنبد پر بیٹھتے ہیں اور غریب خدا کے نام پر مانگتا مانگتا خدا کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ یہی

ہوتا رہا۔ یہی ہو رہا ہے۔

مگر رمضانی مایوس نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ دنیا میں ایک ایسا غریب بھی آیا جو غریبوں میں رہا۔ غریبوں کے لئے پیٹ پر پتھر باندھے فاقے کئے، پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنے، کملی اوڑھ کر فرش پر سویا" قصر سلطانی" کے گنبد اس کے قدموں پر گر گئے۔ حکومت آئی اقتدار آیا۔ دولت آئی۔ مگر سب غریبوں میں بٹ گئی اس نے نہ کوئی رنگ محل بنایا نہ جاگیر چھوڑی۔ اس کے پاس خدا کا نام تھا۔ اس نے وہی خدا کا نام چھوڑا۔ غریبوں نے اس کا کلمہ پڑھا۔ آج بھی غریب جب اس کا نام لیتے ہیں تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ محبّت کے آنسو۔ عقیدت کے آنسو۔ غریبوں کا وہ محسن اعظم جس کی زندگی صرف غریبوں کی بھلائی اور خوش حالی کے لئے تھی۔ جو غریبوں کے نام پر اقتدار حاصل کر کے" قصر سلطانی" کے گنبد پر نہیں بیٹھا اور پھر اس کے ملک کو اپنانے والوں نے بھی امیری میں فقیری کی وہ غریبوں کے لئے جئے۔ پھر اسکے بعد شہنشاہیت آئی۔ ملوکیت آئی، فسطائیت آئی۔ جمہوریت آئی۔ اشتراکیت آئی غریبوں کے نام پر سب نے اقتدار حاصل کیا۔ سب" قصر سلطانی" کے گنبد پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔ اور غریب یہ تماشا دیکھتا رہا۔!

رمضانی کو یقین ہے۔ وہ ایک بار پھر دیکھے گا۔ اگر وہ نہ دیکھ سکا

تو دنیا بھر کے رمضانی دیکھیں گے کہ غریب کے نام پر غریب کو دھوکہ دینے کا یہ کھیل ختم ہو گا اور پیسہ ہضم ہو گا۔

دنیا مانے گی کہ "کامن مین" کا محسن اعظم پیغمبر اسلام تھا، جو غریبوں میں پیدا ہوا، غریبوں میں رہا۔ اور غریبوں میں رہے گا دنیا اس کے بتائے راستے پر چلے گی۔ کوئی بھوکا نہ رہے گا۔ کوئی ننگا نہ رہے گا۔ کوئی آقا نہیں رہے گا۔ کوئی غلام نہیں رہے گا۔

(۱۴، اپریل ۵۷ء)

نئے سال کا استقبال

میں زندگی کی بیاسں بہاریں دیکھ چکا ہوں۔ ممکن ہے آپ نے زیادہ دیکھی ہوں یا کم۔ مگر رمضانی کے نقطۂ نظر سے ان بہاروں کو بہاریں کہنا بہاروں کی توہین ہے۔ بہرحال بچپن کا ذکر چھوڑیئے۔ وہ دن بادشاہی کے تھے۔ لنگوٹی میں پھاگ کھیلتے رہے اور سمجھے کہ زندگی نام ہے اچھلنے کودنے کا۔ کھیلنے کا۔ پڑھنے کا۔ ان دنوں جب نیا سال آتا تھا تو اس کی خوشی ہم سے زیادہ اسکو ہوتی تھی جو ہمیں گود میں لئے بیٹھی تھی یا اس کو جو حقہ پیتا تھا۔ ہمیں ہنستا دیکھ کر باغ باغ ہوتا تھا۔ کہ یہ

بڑا ہو گا. کمائے گا. آپ کھائے گا. ہمیں کھلائے گا۔ خیر صاحب! جیسے جیسے ہم بڑے ہوتے گئے۔ ہم نے یہی یہی دیکھا کہ ہر نیا سال اپنے ساتھ امیدیں لے کر آتا ہے اور مایوسیاں چھوڑ کر چل دیتا ہے. جہاں ہر برس امیدیں بڑھتی ہیں اور ان کے ساتھ مایوسیاں بھی بڑھتی ہیں اور ان امیدوں اور مایوسیوں کے درمیان ہم بھی بڑھتے ہیں۔ جب سے شعور نے آنکھ کھولی ہے یہی نقشہ دیکھا ہے لیکن دل کو ہم نے ہمیشہ یہی کہا کہ ؎

اے دل بے تاب ٹھہر!

جب تک اجنبی ہاتھوں کا ظلم اور ستم تھا ہم یہی کہتے تھے کہ یہ ظلم اور ستم ع

آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

اس دَور میں نئے برس کی خوشی اجنبی دیس کے حکمرانوں کو ہم سے زیادہ ہوتی ہے اور ہم ہر برس سال نو کے جشن کی جگہ "جشن بیچارگی" اور "عید محرومی" مناتے تھے۔

تسکین کا صرف ایک پہلو تھا اور وہ یہ کہ جو کچھ ہے نہیں ہو گا اور یہ سب کچھ جو ہو رہا ہے محض اس لئے ہے کہ اجنبی ہاتھوں کی لوٹ کھسوٹ جاری ہے ان ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی نہیں ہے۔ جب گرفت ڈھیلی ہو گی تو زندانوں کے در کھلیں گے۔ زنجیریں ٹوٹیں گی۔ آسمان پرانا سہی مگر اس پر ایک نیا آفتاب طلوع ہو گا۔ نئی روشنی پھیلے گی۔

خوشیاں ناچیں گی - بہاریں مسکرائیں گی - دودھ اور شہد کی نہریں بہہ نکلیں گی - کوئی مجبور نہ ہوگا - کوئی محکوم نہ ہوگا - اسی دن کے لئے ہم نے دن گنے - کڑیاں جھیلیں - صعوبتیں برداشت کیں - آخر کار وہ دن آگیا - میں اس دن سے پہلے کے ان دنوں کا ذکر نہیں کروں گا - جو تاریک دن تھے - ان دنوں بھی نئے سال آئے تھے اور پرانے ہو کر "جونا مارکیٹ" میں پہنچ جاتے تھے یہ نیا سال واقعی نیا سال تھا - اس لئے کہ زندانوں کے دَر کھل گئے - زنجیریں ٹوٹ گئیں - اجنبی ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہی نہیں بلکہ بالکل ہی ختم ہوگئی - پرانے آسمان پر نیا آفتاب طلوع ہوا اور نئی روشنی پھیلی - یہاں سے ہماری اصل زندگی اور اس کے نئے سال شروع ہوتے ہیں -

---

اب تک نو سال نئے ہو کر آئے اور پرانے ہو کر چلے گئے - ہر سال نئی امیدیں بندھیں اور جب نیا سال آیا تو وہ ٹوٹ گئیں اور ان کی جگہ نئی امیدوں نے جنم لیا - چاہیئے تو یہ تھا کہ انقلاب کے بعد وہ نقشہ نظر نہ آتا - جو پہلے نظر آتا تھا لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا - وہی بے چارگی - وہی مجبوری - وہی محرومی - وہی تاریکی - وہی بدقسمتی ہمارے ساتھ تھی - البتہ فرق اتنا تھا کہ پہلے اجنبی ہاتھوں کا ظلم اور ستم تھا لیکن اب "اپنوں" کی "کرم فرمائیاں" تھیں - غیروں سے تو ہم بات بات پر الجھتے تھے لیکن "اپنوں" کو ہم نے اپنا جانا اور اپنا سمجھا اور سوچا کہ یہ ماریں گے بھی تو کم از کم چھاؤں میں ڈال دینگے مگر ایسا نہ ہو سکا - محسوس یہ ہوا جیسے "گورے ہاتھ" کی

جگہ " کالے ہاتھ " نے لے لی ہے مگر طریق کار وہی ہے۔ ان نو سالوں میں سُکھ تو کیا ملتا۔ البتہ زندگی کو اور دکھوں نے گھیر لیا۔ یہ دکھ بڑھتے ہی گئے۔ اور آج جبکہ نیا سال آیا ہے، یہ دکھ اور بڑھ گئے ہیں۔

کون آتا ہے۔ کون جاتا ہے؟ اس سے ہمیں کیا غرض —— ہم کو سیاست سے کیا واسطہ۔؟ ہم تو چاہتے ہیں ہمارے دکھ کم ہوں۔ ہمیں محل نہ ملیں مگر سر چھپانے کے لئے جگہ ملے۔ ہمیں چپڑی اور دو دو نہ ملیں روکھی سوکھی ملے۔ ہمیں اطلس وکمخواب نہ ملے، مگر گاڑھے گزی سے ہی تن ڈھانپ لیں۔ ہمیں اعلیٰ تعلیم نہ ملے مگر تعلیم ملے۔ ہمیں دوا ملے۔ ضروریات زندگی ملیں۔ ہماری زندگی کا معیار اونچا ہو۔ سیاست کو سیاست والے جانیں ہم تو وہ نیا سال دیکھنا چاہتے ہیں جب ہمارے دکھوں کا خاتمہ ہو۔ اسی نئے سال کا ہمیں آج بھی انتظار ہے۔ معاف کیجئے زندگی کی بیالیس بہاریں دیکھنے کے بعد میں جو نیا سال دیکھ رہا ہوں وہ پرانی شراب ہے۔ جو نئی بوتل میں میرے سامنے رکھی ہے۔ اس "جام نو" کو "سالِ نو" کہتے ہیں مختصر طور پر میں یہ کہہ سکتا ہوں۔

"پرانا حال —— نیا سال"

دعا کیجئے اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ کو بھی وہ سال دکھائے۔ اب میں بھی یہی کہتا ہوں اور آپ بھی یہی کہتے ہیں کہ۔ ہمارے لئے کیا ہے۔؟ کچھ بھی نہیں

(۲۰۔ جنوری ۵۷ء)

" وغیرہ وغیرہ "

سائیں سلیمان بادشاہ کہتا ہے کہ میں بڑی شدت سے سوچ رہا ہوں ۔ جی ہاں بڑی شدت سے ۔ کیا سوچ رہا ہوں ؟ یہ سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ فٹ پاتھ پر ایک " فٹافٹ فوٹو ہاؤس " کھول لوں ۔ یہ درست ہے کہ فٹافٹ فوٹو ہاؤس کی تصویریں نقل مطابق اصل نہیں ہیں ان کا کمال یہ ہے کہ اچھا خاصا دو آنکھوں والا آدمی جب تصویر میں آتا ہے تو " واحد العین " بن جاتا ہے ۔ یعنی میرا مطلب ہے کہ اس کا ایک چراغ گل ہو جاتا ہے یعنی ایک آنکھ سے دیکھنے لگتا ہے وہ سب کو ـــــ

میں نے جو پاسپورٹ بنوایا تو ایک "فنافٹ فوٹو" بھی اتروایا۔ رمضانی نے کہا۔ دیکھو پیارے یہ کس کی تصویر ہے ۔؟ تو بوجھ لے تو پان دانہ دار مشکی زردے اور قوام والے کھلاؤں گا تجھے"!۔ رمضانی نے تصویر دیکھی اور کہا۔ "ارے کیا تم اتنا بے خبر سمجھتے ہو مجھے۔ دیکھو میں ابھی بتاتا ہوں یہ تصویر ہے ۔ یہ تصویر ہے کہڈوں کس کی ہے ۔؟ مگر پیارے! پان کے ساتھ سگرٹ بھی ہونا چاہیئے۔ انعام میں سگرٹ نہ ہوں تو پھر بیڑی بھی چلے گی۔ کیونکہ بیڑے کا جوڑ بیڑی سے تو ہی ہے۔ سائیں بادشاہ نے کہا۔ پیارے بوجھ تو سہی سگریٹ بھی پلاؤں گا۔ اور وہ قلفی ملائی والی بھی کھلاؤں گا تجھ کو۔۔۔ رمضانی نے کہا" وہ مارا وہ مارا ہاتھ لا استاد۔ بوجھ لیا میں نے یہ تصویر ہے اس ٹھیلے والے کی جو ہماری گلی کے نکڑ پر کہتا ہے :۔

- "کراری ہو رہی ہے گجک"
- "کراری ہو رہی ہے مہربان"
- "قدردانوں کے سودے ہیں"

۔۔۔۔ سائیں بادشاہ کہتا ہے کہ بس سر ہی تو پیٹ لیا یہ سن کر میں نے جی تو چاہا کہ انعام میں بھرپور چانٹا رسید کروں ۔۔۔۔ ایسا چانٹا جو "فنافٹ فوٹو" کی طرح اس کا حلیہ بھی بگاڑ دے۔ مگر صاحب اس کا کیا قصور؟ قصور تو ہے "فنافٹ فوٹو" کا جو کیا سے کیا بنا دیتا ہے آدمی کو۔ خیر ایسے فوٹو تو میں بناؤں گا نہیں، اور کیمرہ بھی کچھ بڑھیا والا خریدوں گا مگر "فنافٹ فوٹو ہاؤس" ضرور کھولوں گا۔ بس شدت سے یہی سوچ رہا ہوں

جی ہاں بڑی شدت سے سوچ رہا ہوں ۔ کیوں سوچ رہا ہوں ۔ یوں سوچ رہا ہوں کہ اعلان ہوا ہے کہ مہاجرین کی اب مردم شماری ہوگی یعنی وہ سبھی شمار قطار میں اب آئیں گے ۔ اور ان کو شناختی کارڈ ملیں گے جن پر پاسپورٹ کی طرح تصویریں لگیں گی ۔ اب اللہ آپ کا بھلا کرے ۔ آپ سوچئے کہ میں کیوں نہ "فٹافٹ فوٹو ہاؤس" کھولوں ۔ فرض کیجئے ۔ اگرچہ فرض کرنا فرض نہیں ہے بہرحال تھوڑی دیر کو فرض کیجئے ۔ کہ کراچی میں مہاجرین کی تعداد ہے ۔ دس لاکھ ! ـــــ ٹھیک سے تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ درست تعداد ہے ۔ بہرحال فرض کیجئے کہ دس لاکھ تعداد ہے مہاجرین کی یہاں تو اس کا مطلب یہ ہوا میرے بھائی ! کہ دس لاکھ تصویریں بنیں گی ۔ ان کی اور یہ بھی فرض کیجئے ۔ کہ ایک تصویر کے ملتے ہیں آٹھ آنے تو دس لاکھ کے ہوئے پانچ لاکھ ۔ بس بندے کے ہاتھ لگیں گے ۔ پانچ لاکھ چہرہ شاہی نصف جن کے ہوتے ہیں مبلغ اڑھائی لاکھ چہرہ شاہی ۔ یہ رقم اگر ہاتھ آگئی بندے کے ۔ تو فٹافٹ فوٹو کی طرح فٹافٹ یہ رقم لے کر جاؤں گا ۔ اور فٹافٹ کا ٹن ایکسچینج خرید لوں گا ۔ سال دو سال گزارہ تو ہو ہی جائے گا ۔

خیر یہ بات تو بہت ہی اچھی ہے کہ شناختی کارڈ بن رہے ہیں اور میں "فٹافٹ فوٹو ہاؤس" کھول رہا ہوں ـــــ فٹ پاتھ پر ـــ مگر ایک دوسری نخ بھی تو لگا دی ہے مہاجرین کے محکمے والوں نے نخ یہ ہے کہ جھونپڑی پر نمبر لگائے جائیں گے ۔ یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر کیوں نمبر لگائے جائیں گے ۔ جھونپڑیوں پر ؟ دیکھئے اب تو یہ

آسانی ہے کہ ایک جگہ جگھیاں بنالیں اور کل ان کو اٹھا دیا پگڑی پر۔ اور وہاں بن گیا "فٹافٹ موٹر گیراج" پھر کہیں جا کر جھگی ڈال لی۔ اگر نمبر لگائے گئے جھگیوں پر تو اس کا مطلب یہ ہے کہ چراغ گل پگڑی غائب! اور اگر "پگڑی" ہی غائب ہوگئی تو پھر عزت ہی کیا رہی۔ خاک۔!

خیر تو یہ بات تھی "فٹافٹ فوٹو ہاؤس" کی اور یہ وغیرہ وغیرہ تو ہوتا رہے گا بعد کو بھی۔ مگر ایک اور بات بھی سنی ہے۔ وہ یہ کہ کوئلے کی کچھ کمی ہے اور کوئلہ مہنگا ہو رہا ہے۔ کوئلوں کی دلالی میں منہ کالا تو ہو گا اور اس رعائت سے ہو گا کہ کوئلہ زیادہ ہے تو زیادہ۔ اور کم ہے تو کم —— بڑی شدت سے سوچ رہا ہوں کہ لے کاش میں بھی دوراندیشی سے کام لیتا اور لکڑیاں خرید کر بھر لیتا اپنے ٹال میں تو وقت پر منہ مانگے دام ملتے اور وارے نیارے ہو جاتے۔ بہرحال یہ حماقت ہو چکی۔ جی کو کیوں جلائیں بات تھی کوئلوں کی مہنگائی کی کوئلے کی قلت ہوگی تو "بلیک مارکٹ" ہوگی۔ اور بلیک مارکٹ کوئلوں ہی کی درست ہے یعنی کوئلے بھی "بلیک اور مارکیٹ بھی "بلیک" یہ جو پچھلے دنوں انڈوں کی "بلیک مارکٹ" ہو رہی تھی۔ وہ تو اصل میں "وہائٹ مارکٹ" تھی۔ انڈے سفید ہوتے ہیں۔ یعنی "وہائٹ" تو ان کی "بلیک مارکیٹ" کو "وہائٹ مارکیٹ" ہی تو کہنا چاہیئے۔ ہاں اگر انڈوں اور کوئلوں کی ایک ساتھ "بلیک مارکیٹ" ہو تو اس کو ہم "بلیک اینڈ وھائٹ مارکٹ" بھی کہہ سکتے ہیں خیر یہ بھی تیر نکل گیا کمان

سے "مورکھ من اب کیوں پچھتائے" !

فرض کیجئے اگر میں کوئلوں کی بلیک مارکیٹ کرتا تو ظاہر ہے. کہ بڑا فائدہ ہوتا۔ اور حاسد انگاروں پر لوٹتے۔ خیر اسے بھی چھوڑیئے۔ قسمت ہمارے ساتھ ہے جلنے والے جلا کریں ـــــ ہاں تو ۔ فائدہ ہوتا جب ہمیں اس کاروبار میں تو ہم ایک اسکول کھول لیتے رسوخ تو ہمارا ہے ہی۔ اسکے لئے جگہ بھی مل ہی جاتی۔ فرض کیجئے۔ تین چار سو بچے پڑھتے اس اسکول میں اور اگر فرض کرنا ہی ہے تو چار سو ہی سمجھ لیجئے. ہاں اگر چار سو بچے پڑھتے اس اسکول میں تو کیا ہوتا۔؟ فیسیں تو آپ جانتے ہیں کہ بڑھ چڑھ کر لی جاتی ہیں تیس روپے تک تیس اور فیس کا قافیہ بھی ایک ہے مگر ہم کارخانے کی مشہوری اور خلق خدا کی بھلائی کے لئے اگر ایک بچے سے دس روپے مہینہ فیس بھی لیتے تو۔ دس ضرب چار سو۔ جواب آیا۔ چار ہزار روپے لطف جن کے مبلغ دو ہزار روپے ہوتے ہیں۔ بس آمدنی ہوئی چار ہزار روپے مہینہ ۔ اور خرچ سمجھئے کہ تین استانیاں سو سو روپے مہینے کی۔ یعنی تین سو روپے ! چار ہزار منفی تین سو جواب آیا۔ تین ہزار سات سو روپے مگر اس کاروبار میں بھی خسارہ ہے. اول تو تین ہزار سات سو کا کاروبار بھی کوئی کاروبار ہے اس سے تو گھاس کھودنا بہتر ہے۔ بہرحال سودا یہ خسارے کا ہے۔ کیوں ؟

اسلئے کہ چپراسی کو تنخواہ دینا پڑتی ہے۔ مہتر کو پیسے دینا پڑتے ہیں اور گھڑے خریدنے پڑتے ہیں پانی کے لئے ۔ چپراسی مہتر اور گھڑے. کتنا

خرچ اٹھ جائے گا ان پر - یہ سودا مہنگا ہے یعنی تجارتی زبان میں پڑتا نہیں کھاتا - خیر اس کو بھی چھوڑ دیجئے جہاں بُہت وغیرہ وغیرہ نظر آتا ہے۔ وہاں ہم نے یہ وغیرہ وغیرہ بھی دیکھا ہے کہ لوگ پوری شہری آزادی کے ساتھ سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر پیشاب کرتے ہیں ــــ پوچھا:۔

"صاحب یہ کیا حرکت ہے"؟

کہنے لگے ــــ پیشاب خانے کہاں ہیں کہ جہاں پیشاب کریں جاکر ــــ ہم نے کہا۔ یہ آپ کیسے کہتے ہیں۔کہ پیشاب خانے نہیں ہیں ــــ کہنے لگے ــــ ہیں تو سہی ــــ مگر کم ہیں" ــــ

ہم نے کہا۔ بھائی وہ زیادہ اس لئے نہیں بنتے کہ پہلے آپ ان کو تو بھر لیں جو موجود ہیں ــــ جب پیشاب خانوں پر بھی بس کی طرح لائین لگے گی ــــ نئے پیشاب خانے بھی بن جائینگے ــــ جو سیاح آتے رہتے ہیں ہمارے ہاں ان کے آنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ سڑکیں صاف ہو جاتی ہیں ــــ وہ آتے رہے تو سڑکیں صاف ہوں گی لوگ سڑکوں پر پیشاب کم کریں گے - ہم اپنے لئے تو صفائی کا خیال نہیں کرتے شاید ان مہمانوں کے لئے ہی ہمیں شرم آجائے ــــ؟ اور اگر کوئی سیاح دیکھے کہ ہم پیشاب خانے پر لائن لگا کر کھڑے ہیں تو وہ ہماری باقاعدگی پر عش عش کرنے لگے ــــ

خیر یہ وغیرہ وغیرہ بھی چھوڑیئے اور یہ دیکھئے ہمارے اپنے ہوائی جہاز چلے ہیں اور ساڑھے سولہ گھنٹے میں لندن سے کراچی آنے کا ریکارڈ

قائم ہوا ہے کتنی خوشی کی بات ہے کہ ہم بھی آسمان کی خبر لا رہے ہیں اور وہاں پہنچ رہے ہیں۔ جہاں سے ہم کو بھی بقول غالب کچھ ہماری خبر نہیں آتی ـــــ خیر یہ بھی اچھا ہوا کہ ہم خبردار ہو گئے ہوائی جہازوں کے سلسلے میں کچھ وغیرہ وغیرہ ایسا بھی ہے جس کے متعلق ہمیں سوچنا چاہیئے ـــــ

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ ایک زمانے میں ہم بیل گاڑیوں پر ـــــ رتھوں پر ـــــ سفر کرتے تھے پھر گھوڑے آئے ـــ اور اس کے ساتھ "ہارس پاور" آیا۔ موٹریں، بسیں، آئیں، گاڑیاں آئیں اول اول ہر روز گاڑی نئی چلتی تھی کبھی دو دن کے بعد ـــ کبھی ایک دن کے بعد گاڑی چلتی تھی ـــ مسافر نے پوچھا:۔

بابو جی! لالہ موسیٰ گاڑی کب جائے گی؟

جواب ملا:۔

"کل سات بج کر تیس منٹ پر"

اب مسافر نے مسافر خانے کا رخ کیا۔ وہیں بستر جمایا سڑک پر اینٹیں رکھیں چولھا بنایا لکڑیاں جمع کیں ـــــ جلائیں ـــ کھانا پکایا ـــ کھایا ـــ اور لمبی تان کر سو گیا ـــ سو کر اٹھا ـــ حقہ تازہ کیا چلم بھری ـ کش پہ کش لگائے ـــ ریل گاڑی کے انجن کی طرح دھواں چھوڑا آخر تیس گھنٹے گزارنے کے بعد خدا خدا کر کے گاڑی آئی اور وہ ٹکٹ لے کر اس میں سوار ہوا۔ رفتہ رفتہ اس میں اصلاح ہوتی

گئی اور ہم چند گھنٹے پہلے سفر کے لئے اسٹیشن پر آنے لگے ــــــــ یہاں تک کہ یہ دور بھی آ گیا کہ ہم اب دس پندرہ منٹ پہلے اسٹیشن پر آتے ہیں اور گاڑی میں سوار ہو جاتے ہیں ــ

خیر ریل کا وقت تو ٹھیک ہو گیا ہے ــ مگر یہ ہوائی جہاز والے مسافروں کو وقت سے پہلے کیوں بلاتے ہیں؟ اور بٹھائے رکھتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ سفر ایک گھنٹے کا ہے مگر ایک گھنٹے کے سفر کے لئے آپ کو دو گھنٹے زمین پر ہوا کھانا پڑے گی اور پھر آپ ہوائی جہاز میں بیٹھیں گے یعنی زمین کی نسبت ہوائی جہاز کا سفر تیز ہے۔ ہوائی جہاز پر لوگ اس لئے سفر کرتے ہیں کہ وہ فٹافٹ منزل مقصود پر پہنچ جائیں ــ

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ "فٹافٹ فوٹو ہاؤس" کی طرح ہوائی جہاز کا سفر بھی "فٹافٹ سفر" ہے اوپر اڑے اور ادھر آسمان کی خبر لانے کے بعد زمین کی منزل پر اتر گئے ۔

خیر اس وغیرہ وغیرہ کو بھی چھوڑیئے ــــ اور یہ دیکھئے کہ لوگ ہوائی جہاز کے سفر میں بھی بستر ساتھ لے جاتے ہیں۔ حالانکہ دنیا بھر میں کہیں ایسا نہیں ہوتا یعنی کوئی بستر اٹھانے کی زحمت نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ جہاں کہیں بھی مہمان جائے گا میزبان اسکو بستر مہیا کرے گا۔ اگر وہ بستر مہیا نہیں کر سکتا تو آپ کو ٹھہرائے گا نہیں اگر ہوٹل میں قیام ہو تو وہاں بھی بستر مل سکتا ہے۔ ہوائی جہاز آخر ہوائی جہاز ہے اس میں

وزن کی بھی پابندی ہے یہ ریل گاڑی تو نہیں ہے کہ صاحب کے طوطے کا پنجرہ بھی ساتھ ہے ۔ چوہے دان بھی ہمراہ ہے ـــــ ایک عدد صراحی بھی ہے ـــــ پاندان بھی ہے ـــــ اور پھر ٹرنک اور سوٹ کیس بھی ہیں ـــــ اور وہ بھی اتنے کہ مسافر کم ہیں اور ٹرنک اور سوٹ کیس زیادہ ہیں ـــــ ایک صاحب کو ہم نے دیکھا کہ وہ "فولڈنگ چارپائی" بھی ساتھ لائے اور بڑی بے تکلفی سے سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں اس کو بچھایا بستر جمایا اور سو گئے ۔ بہر حال یہ مزے تو ریل گاڑی کے ہیں مگر ہوائی جہاز آخر ہوائی جہاز ہے ـــــ

(۱۶ ، ۱۷ ، ۱۸ ، مارچ ۵۵ء)

"ڈوریہ کے ڈورے"

مولوی گلشیر خان ـــــ آج نور کے تڑکے آ دھمکے کہنے لگے۔

"کچھ سُنا آپ نے ؟"

ہم نے کہا :۔

"کیا" ؟

کہنے لگے ـــ "مادام شفیق ڈوریہ نام کی خاتون مصر سے آئی ہوئی ہیں" !

ہم نے کہا ـــ "جی ہاں آئی ہوئی ہیں" !

کہنے لگے ــــ "اور کچھ سنا آپ نے"؟

ہم نے کہا :-

"کیا"؟

کہنے لگے ــــ بھائی میرے! یہ جو "ڈوریے" ہیں نا!- یہ ڈورے ڈال رہی ہیں ہماری عورتوں پر ــ کہتی ہیں کہ عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق ملنے چاہئیں ــ آپ جانتے ہیں کہ اللہ نے عورت کو عورت اور مرد کو مرد بنایا ہے۔ دونوں کو الگ الگ کام سونپ دیا ہے مرد ہل چلاتا ہے عورت روٹی پکاتی ہے ــ مرد کماتا ہے۔ باہر کے کام کی دیکھ بھال کرتا ہے ــــ عورت گھر کا کام سنبھالتی ہے۔ یعنی اگر ایک "وزیر خارجہ" ہے تو دوسرا "وزیر داخلہ" ہے۔ اب اگر یہ دونوں گھر سے باہر نکل جائیں تو پھر گھر بنانے کی کیا ضرورت ہے"؟

اپنا لٹھ زمین پر ٹیکتے ہوئے ــ مولوی گلشیر خان نے کہا ــ "سورج مشرق کے بجائے مغرب سے نکل سکتا ہے۔ آم کے درخت سے انار پیدا ہو سکتے ہیں۔ پتھر سے موم بنائی جا سکتی ہے۔ پر کا کوا بن سکتا ہے، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ عورت مرد برابر ہو جائیں ــ میں بات کو طول دینا نہیں چاہتا صرف ایک بات کہتا ہوں اور بڑی وزنی بات!

وہ یہ کہ اگر عورت مرد برابر ہوتے تو ضرور اللہ تعالیٰ کسی عورت کو بھی پیغمبر بنا کر نازل کرتے مگر ایسا نہیں ہوا۔ پس ثابت ہوگیا کہ عورت عورت ہے اور مرد مرد — یہ برابر ہو ہی نہیں سکتے لاحول ولا قوۃ۔ خدائی انتظام میں دخل دیں۔ توبہ توبہ —— لاحول ولا قوۃ"!

مولوی گلشیر خان نے ذرا —— رازدارانہ لہجے میں کہا —— میرے بھائی! — پہلے ہی عورتیں ہمارے سر پر سوار ہیں اور اگر اس "ڈوربہ" نے یونہی "ڈورے" ڈالے اور ان کے کان میں "اسم اعظم" پھونک دیا تو یہ فتنہ بڑھ کر قیامت ہوجائے گا۔ اور اب دیکھتی آنکھوں دیکھ لیجئے گا کہ قیامت سے پہلے قیامت آجائے گی —— پہاڑ تو روئی کے گالوں کی طرح اڑیں گے ہی لیکن ہم لوگوں کے ایسے پرزے اڑیں گے کہ غالب کے بھی کیا اڑے ہوں گے"!

مولوی گلشیر خان نے ذرا — داڑھی کو کھجاتے ہوئے کہا ——!

"غضب خدا کا ہم خدا سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا بیوی سے ڈرتے ہیں اور آپ ہی نے تو ایک شعر کہا ہے کہ ؎

جو ڈر ہے ان کو تو بیگم کی برہمی کا فقط
نہ وہ خدا سے نہ خلق خدا سے ڈرتے ہیں

اور وہ جو اپنے حاجی لق لق نے کہا ہے کہ ؏

اک خدا سے اور اک بیوی سے ڈرنے کیلئے

—— آپ ذرا سوچئے تو سہی۔ کہ مادام ڈوریہ نے اگر یونہی" برابر سرابر" کرنے کے ڈورے ڈالے تو پھر ان" بیوی لوگ" کے مزاج کا پارہ آسمان کی خبر لائے گا یا نہیں؟ —— اب تو چار بیویاں ہماری جان کو رولیتی ہیں مگر صاحب! پھر تو ایک بیوی بھی جان کو لاگو ہوگی اور ایسی کہ پھر ہر جمعہ کے دن حجامت بنوانے کی بھی ضرورت نہ رہے گی ——

مولوی گلشیر خان نے سر سے پگڑی اتار کر میز پر رکھ دی اور کہا —— کہ دیکھئے میرے سر پر زیادہ نہ سہی تھوڑے بہت بال تو سلامت ہیں۔ مگر یقین کیجئے صاحب کہ پھر تو ایک بال بھی نہیں بچے گا اور جب کوئی پوچھے گا:۔

"کہئے بال بچوں کا کیا ہے"؟

تو ہم کہیں گے کہ بچے تو خیر بچ گئے ہیں لیکن بال ایسے رخصت ہوگئے ہیں کہ بس ہم" فارغ البال" نظر آتے ہیں۔

مولوی گلشیر خان —— آج بڑے موڈ میں نظر آئے۔ ہم نے پاؤ بھر کھجوریں اور ایک پانی کا گلاس سامنے رکھا۔ تو کہنے لگے:۔ میں شیشے کے گلاس میں پانی نہ پیؤنگا۔ یہ خلاف سنت ہے۔ کہیں سے" آبخورہ" منگوایئے —— یا مٹی کا پیالہ ہی لا دیجئے"! ہم نے کہا ——" مولوی صاحب قبلہ۔ مٹی کا پیالہ تو نہیں البتہ مٹی کی ہنڈیا کا ڈھکنا حاضر ہے۔ اسی میں شوق فرمایئے۔" مولوی صاحب بولے ——" ہاں یہ بھی چلے گا" کھجوریں کھا کر

مولوی گلشیر خان نے پانی نوش جان فرمایا پھر تو وہ اور بھی موڈ میں آگئے کہنے لگے: "وہ آپ نے لطیفہ نہیں سنا؟" ــــ ہم نے کہا "کیا"؟

فرمایا کہ ایک شخص بازار میں بیوی کا جوتا خریدنے گیا۔ اتفاق سے جوتے کا ناپ کھو گیا۔ بڑا پریشان ہوا۔ تمام جیبیں دیکھ ڈالیں مگر وہ کاغذ نہ ملا۔ جس پر ناپ تھا ــ کہنے لگا۔ آپ پھر پیر الٰہی بخش کالونی جاؤں اور وہاں سے ناپ لاؤں ــ وقت ضائع ہو گا ــ اس نے سر سے ٹوپی اتاری ٹھنڈی ہوا کا جھونکا جو سر سے ٹکرایا۔ تو بس مسئلہ حل ہو گیا ــــ دکاندار سے کہا ــــ صاحب ناپ تو کہیں کھو گیا البتہ میرے سر پر جہاں جہاں بال نہیں ہیں بس سمجھ لیجئے کہ جوتے کا ناپ وہی ہے۔

ہم نے کہا ــــ "واہ مولوی صاحب! پاؤ بھر کھجوریں اور ایک گلاس پانی پی کر آپ نے وہ بات کہی ہے کہ کوئی "برانڈی" کی پوری بوتل بھی پی کر کیا کہے گا ــــ سبحان اللہ ــــ واہ واہ! ــــ مولوی صاحب کہنے لگے ــــ "دیکھو بھائی میرے! جو مادام شفیق "ڈوریہ" یا "درّیہ" جو کچھ بھی ہیں انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ چار شادیاں نہیں کرنی چاہئیں میں اب عورت ذات کے کیا منہ آؤں ورنہ وہ فتویٰ دیتا کہ جواب بن نہ پڑتا۔ خیر چھوڑیئے اس قصّے کو ــــ بات اصل میں یہ ہے کہ پہلی بات جو مادام شفیق نے کہی ہے کہ عورت مرد "برابر برابر" ــــ اس کے بعد چار شادیوں کی بات ان کو نہیں کہنا چاہیئے تھی ــــ کیونکہ جب وہ عورت

کو برابری کا درجہ دے دیں گے تو پھر یہ فتنہ قیامت بن کر وہ قیامت ڈھائے گا کہ کچھ پوچھیئے نہیں ـــــ اور پھر چار تو خیر بہت ہیں کوئی شخص دوسری شادی کرے گا بھی تو اس کا حُلیہ اس بری طرح بگڑے گا کہ آئینے میں وہ اپنی صورت خود بھی نہیں پہچان سکے گا ـــــ اور اگر کوئی چار شادیاں "برابر برابر" ہونے کے بعد کرے گا تو اس کی ـــــ "طلعت مبارک" ـــــ دیدنی ہوگی ـــــ وہ یوں نظر آئے گا جیسے ـــــ انڈے سے ابھی ابھی کوئی چوزہ نکلا ہے !

(۱۲- جنوری ۱۹۵۵ء)

واہ رے "دلدار کی دلداریاں"

ابوالاثر حضرت حفیظ جالندھری کا ایک شعر ہے۔

سوچ کر غم دیجئے ایسا نہ ہو
آپ کو کرنا پڑیں دلداریاں

مگر جن معنوں میں ہمارے ان داتا مسٹر دلدار احمد ہم دمضاینوں کی دلداریاں فرما رہے ہیں اس میں سوچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ؟ کیونکہ آجکل دل آزاری کا دوسرا نام دلداری ہے۔ یہ انوکھی منطق تو آپ سن چکے ہیں کہ انھوں نے فرمایا کہ گندم کے بڑھے ہوئے دام

بھی دنیا کے دوسرے ملکوں سے کم ہیں لیکن ساتھ ہی حضرت نے یہ بھی انکشاف فرمایا کہ گندم کے دام بڑھنے سے کاشتکاروں کو فائدہ پہنچے گا۔ مشرقی پاکستان کے متعلق میری معلومات ناقص ہیں لیکن جہانتک مغربی پاکستان کا تعلق ہے۔ یہ ڈھکی چھپی بات نہیں کہ یہاں بڑی بڑی زمینداریاں اور جاگیرداریاں موجود ہیں اگر دام بڑھے تو اس کا فائدہ ہاری کی بجائے "وڈیرا لوگ" "نواب لوگ" اور "چوہدری لوگ" کو ہوگا۔ زمینداریوں اور جاگیرداریوں کو ختم کرنے کی بجائے ہم نئے زمیندار نئے وڈیرے اور نئے جاگیردار پیدا کر رہے ہیں۔ غلام محمد بیراج کی زرخیز زمینوں ہی کو لے لیجئے۔ یہاں بڑے لوگوں کو ہزاروں ایکڑ زمین دی گئی ان کی زمینداری کو بحال کیا گیا اور لطف یہ ہے کہ یہ سب کچھ بحالیات کے نام پر ہوا۔ اس بات کو اندھا بھی دیکھ لے گا۔ کہ قیمتوں میں اضافے سے کاشتکار کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ دوسری طرف رمضانیوں کی پریشانی اور بدحالی بڑھے گی۔

مغربی پاکستان کی حکومت کے وزیر خوراک میر علی احمد خان تالپور نے اعلان کیا ہے کہ صوبائی حکومت گندم اور چینی کے نرخوں میں اضافہ کی کوئی تجویز منظور نہیں کرے گی انھوں نے صاف لفظوں میں کہا ہے کہ ہمارے ہاں اناج کی قیمتیں پہلے ہی بہت زیادہ ہیں اسلئے ان قیمتوں میں مزید اضافہ غیر مناسب ہوگا۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ جب

تک میں وزیر خوراک ہوں گندم اور چینی کے نرخ بڑھنے نہیں دوں گا آپ نے مزید کہا کہ اب کی برس فصل بہت عمدہ ہوئی ہے اور نئی فصل کے مارکیٹ میں آنے پر گندم کی صورت حال بہت بہتر ہو جائے گی - سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مرکزی حکومت کی دلداری مغربی پاکستان والوں کے آڑے آئی تو وہ کیا کرینگے ؟ - اگر اس قیمت پر جس کا اعلان کیا گیا ہے مرکز نے صوبے کو گندم اور چینی مہیا کی اور حکومت مغربی پاکستان نے لوگوں سے دام کم وصول کئے تو کروڑوں روپے کا نقصان کون ادا کرے گا ؟ خیر ہمیں اس سے سروکار نہیں ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ مسٹر سہروردی جیسے عوامی وزیر اعظم کے دور میں عوام کی پریشانیوں کو ہر حالت میں کم ہونا چاہیئے -

---

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ مولوی گلشیر خان آ گئے - کہنے لگے - "کیا کر رہے ہو ؟ — میں نے کہا "قلم گھسائی" — کہنے لگے - "مگر لکھ کیا رہے ہو" - ؟ میں نے کہا — " گندم اور چینی کی قیمتوں کے سلسلے میں ڈلدار ملت" "مسٹر دلدار احمد کے بیان کا "پوسٹ مارٹم" کر رہا ہوں" - کہنے لگے چینی کے متعلق ضرور لکھو تاکہ لوگ حلوہ پکائیں — اگر اس کی مہنگائی ہوئی تو اپنی جمعراتیں تاریک سے تاریک ہو جائیں گی - البتہ گندم کا ذکر چھوڑ دو — میں نے کہا — کیوں ؟ کہنے لگے مسلمان ہو کر اتنا بھی نہیں جانتے اور پھر تم آدمی ہو یعنی آدم کی اولاد - کس چیز

نے نکلوایا تھا جنت سے آدم کو؟ —— ارے یہی دانہ گندم ہی تو تھا نابکار۔ جو ہمیں یہاں لے آیا کھینچکر۔ وہ جو کہا تمہارے کسی بھائی بند نے کہ

آدم نے کھا کے دانۂ گندم کو کیا کہیں
اپنی تو کیا ہماری بھی مٹی خراب کی

تو غلط تھوڑا کہا ہے۔ اگر چینی کی قیمت حکومت نہ بڑھائے تو میں فتویٰ لکھنے کو تیار ہوں کہ گندم کی مہنگائی جمہوریہ اور وہ بھی اسلامیہ میں بالکل جائز ہے۔ گندم نے آدم کو جنّت سے نکالا — اور جو ہم گناہ کرتے ہیں یہ بھی اصل میں فتور گندم ہے۔ اگر گندم نایاب بلکہ ناپید ہو جائے تو برائیاں ختم ہو جائیں کیونکہ دمشق میں ایسا ہو چکا ہے ؎

چناں قحط سالی شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

اور پھر نور معرفت کے لئے معدے کا طعام سے خالی ہونا ضروری ہے ؎

اندروں از طعام خالی دار
تا دراں نور معرفت بینی

بس میری طرف سے لکھ دو —— "دلدارِ ملّت" مسٹر دلدار احمد کو کہ چینی دو پیسے سیر کر دے اور گندم کو خلاص کر دے۔ میں نے کہا جناب مولوی صاحب! سوجی نہیں ملے گی تو حلوہ کیسے بنے گا؟ کہنے لگے۔ ہاں بھائی یہ معاملہ بڑا ٹیڑھا ہے۔ سوجی بھی سستی ہونی چاہیئے۔

خدا کا شکر ہے کہ مولوی صاحب کو ہوش آیا۔ چاہے دیر میں آیا — دیر آید درست آید!

چینی کا ذکر چلا ہے تو ایک دلچسپ بات سن لیجئے جن دنوں چینی کی افراط تھی میں ڈاکٹر سید یاور عباس صاحب کے زیر علاج تھا اور ان ہی دنوں مجھے "شوگر" آتی تھی۔ انہیں دنوں حاجی لق لق کراچی آئے اور لاہور واپس جا کر انھوں نے "زمیندار" میں لکھا ؎

بخت ور ہے مجید لاہوری
جس کو گھر بیٹھے "شوگر" آتی ہے

اب جبکہ چینی کا توڑا پڑا تو میں نے پھر "قارورہ" ٹیسٹ کرایا — تو معلوم ہوا کہ "شوگر" آنا بند ہوگئی ہے۔ گویا ان دنوں میری "مزان شوگر فیکٹری" بند ہے۔ جن دنوں ہمارے وزیر اعظم مسٹر حسین شہید سہروردی چین گئے تھے رمضانی نے کہا تھا کہ اب "نکتہ چینی" مت کرو کیونکہ چینی کا معاملہ ٹھیک ہو جائے گا مگر سہروردی صاحب کی واپسی پر بھی یہ مسئلہ جوں کا توں رہا اور ظریف جبلپوری کو کہنا پڑا

"پرائم منسٹر" گئے چین لیکن
وہ چینی کا پرمٹ کہاں چھوڑ آئے

اسکے بعد خود چین کے وزیر اعظم مسٹر چو این لائی آئے مگر خود آئے چینی ساتھ نہ لائے۔ ورنہ ہم انہیں بجائے مسٹر چو این لائی کے

"مسٹر چینی لائے کہتے - ان کے جانے کے بعد شام کے 'شکری القوا تلی' آئے لوگوں نے کہا شکر ہے کہ شکری کے آنے سے شکرؔ کا معاملہ ٹھیک ہو جائے گا مگر وہاں انھوں نے بھارت میں قدم رکھا اور یہاں شکر کا معاملہ سیدھا ہونے کی بجائے ٹیڑھا ہو گیا - گویا وہ شکری القوا تلی کے بجائے "قاتل الشکر" نکلے -

خیر یہ تو تفنن طبع کی باتیں ہیں - لاکھ باتوں کی ایک بات یہی ہے "جو حضرت دلدار ملت" کی خدمت میں ہم عرض کرینگے کہ حضور! غصے کو تھوک دیجئے - ہم پر کرم فرمایئے چینی اور گندم کے دام نہ بڑھایئے آپ "شیریں دہن" سہی لیکن اتنے بھی نہیں کہ آپ کو" جواب تلخ "زیب دے سے

تلخی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی

(۲۴ - جنوری ۱۹۵۷ء)

"آئی بھی وہ ــــ گئی بھی وہ"!

دھوم تھی کہ عید آرہی ہے۔ اگرچہ مہنگائی اور بے زری کے سبب اس بلا کی گرمی میں سرد بازاری کا اندازہ تھا لیکن یہ خیال نہیں تھا کہ میٹھی عید۔ اتنی بے کیف اور پھیکی ہوگی۔ رمضانی نے کہا ــــ بابو جی کیا آج ہڑتال ہے؟ ــــ میں نے کہا ــــ "ارے یہ کیا کہتا ہے ــــ آج تو عید ہے"! ــــ اس نے کہا یہ کیسی عید ہے کہ تمام دکانیں بند ہیں۔ دُور دُور تک آدمی نظر نہیں آتا۔ اور میکلوڈ روڈ پر تو معلوم ہوتا ہے جیسے کرفیو لگا ہوا ہے۔ ہاں یہ درست ہے۔ کہ

سینماؤں پر بڑی بھیڑ ہے —— اور ایک شخص تو کہہ رہا تھا - عید اس کو کہتے ہیں جب سینما پر زیادہ بھیڑ ہو چاہے پکچر کتنی ہی تھرڈ کلاس کیوں نہ ہو -

بہرحال جہاں تک عید کا تعلق ہے ؎

"آئی بھی وہ، گئی بھی وہ ختم فسانہ ہوگیا"

جگنو کی چمک تھی یا کوندے کی لپک کہ پلک جھپکتے ہی ختم - ہم لوگوں کی زندگی میں مسرت کے لمحے ہی کتنے آتے ہیں ؟ بس گن لیجئے انگلیوں پر —— ہاں ان لوگوں کی اور بات ہے جن کا ہر دن عید —— اور جن کی ہر شب - شب برات ہے -

کسی قوم کی خوش حالی کا اندازہ لگانا ہو تو اس کے بچوں کو دیکھئے غریب سے غریب آدمی اپنا پیٹ کاٹ کر بھی اپنے پھول سے بچوں کو سنوارتا ہے - اچھے سے اچھے کپڑے پہناتا ہے - اس نقطہ نگاہ سے جب ہم نے عید کے بچوں کو دیکھا —— تو سخت مایوسی ہوئی —— اعلانات تو بہت ہوئے ہیں کہ پاکستان غریبوں کی خوش حالی کے لئے بنا ہے —— اس لئے یقین کرنا چاہیئے کہ ہماری زندگی میں اگر وہ دن نہ آئے جب ہم غریبوں کو خوشحال دیکھیں مگر آئے گا ضرور چاہے ہمارے مرنے کے بعد ہاں اس وقت کی عید کی جو جھلک نظر آئے گی اگر آپ اس کا تصور بھی کر لیجئے تو سمجھ لیجئے کہ —— آپ کی عید ہوگئی -

عید کے دن کیفیت یہ تھی کہ دن کو کھاتے پیتے ڈر لگتا تھا کہ کوئی کیا کہے گا ــــــ کہ یہ "احترام" سبھی نہیں کرتے اور جو لوگ روزہ دار رہے وہ کھاتے پینے کے وقت محسوس کرتے تھے جیسے ان کا روزہ بھولے سے ٹوٹ گیا ہے۔ سونے جاگنے اور کھانے پینے کے وقت چونکہ تبدیل ہوگئے تھے اسلئے اب وہ آہستہ آہستہ ہی اپنی اصلی جگہ آئیں گے ــــــ یعنی ہم اب رات میں زیادہ سوئینگے اور دن میں کم ــــــ ہاں سونے اور جاگنے کا قصہ چلا ہے تو سنیئے ــــــ کہ عید کے دن وہ لوگ جو سحری کو طرح طرح کی آوازیں لگا کر بارہ بجے سے ہی لوگوں کی نیند کو "راتوں کی نیند حرام کرنے والے جاسوسی ناول" بنا دیتے تھے۔ اپنا معاوضہ لینے کے لئے آئے ایک شخص نے کہا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ میں "احترامی" تھا تم نے جگا کر ناحق مجھے پریشان کیا۔ میرے بس میں ہو تو تم پر جرمانہ کردوں؟ اور تم الٹا مجھ سے معاوضہ طلب کرتے ہو؟

احترام کے سلسلے میں یاد آیا ــ کہ ایک صاحب منہ پر رومال باندھے آئے۔ کسی نے پوچھا ــ حضرت خیریت ہے ــ کہیں چوٹ تو نہیں لگی؟ ۔ کہنے لگے ــــ یہ آپ کیا کہتے ہیں؟ پوچھا کہ یہ منہ پر کیا باندھ رکھا ہے؟ ــــ کہنے لگے۔

"یہ احترام ہے"

اور فوراً کمرے کا دروازہ بند کر کے رومال اٹھایا اور کہا "اور ادھر دیکھو اس احترام کے پیچھے کون ہے"۔ یعنی یہ حضرت منہ پر "احترام" لٹکا کر پان کھا رہے تھے اور کہتے تھے کہ اگر ہوٹل کے دروازے پر "احترام" لٹک سکتا ہے تو منہ پر کیوں نہیں؟ اللہ رحم کرے عید کے موقع پر بڑی عید ملن پارٹیاں ہوتی ہیں۔ لیکن جب سے فریئر ہال میں دھما چوکڑی مچی اور چھینا جھپٹی کا منظر دکھائی دیا کسی کو پھر ہمت نہیں پڑی کہ ایسی پارٹیوں کا احترام کرے ــــ ہمارا دن یوں گذرا کہ صبح جو سوئے تو شام کی خبر لائے اور شام کو چنیوٹ برادری کے "اکٹھ" میں شریک ہوئے۔ یہ اجتماع ہر برس ہوتا ہے اور نہایت سلیقے سے ہوتا ہے۔ لوگ سوڈا لیمن پیتے ہیں مٹھائی کھاتے ہیں ایک دوسرے سے ملتے ہیں ــــ گانے ہوتے ہیں۔ شعر و شاعری ہوتی ہے مگر اب کی برس اس میں لطیفوں کا اضافہ ہیں یعنی حاضرین میں سے ہر شخص مائیکروفون پر آ کر کوئی لطیفہ سناتا تھا اور محفل کشتِ زعفران بن جاتی تھی یہاں معلوم ہوتا تھا کہ واقعی کچھ عید کی جھلک ہے گویا عید" مجلس لطائف" میں تبدیل ہو گئی ــــ ان لطیفوں میں بھارت کی ایک تھوڑی گنتی، والی قوم کے لطیفے زیادہ تھے۔ بہر کیف عید مبارک! ــــ رفتہ و گذشتہ!

(۲۷۔ مئی ۵۷ء)

"جمہوریت"!

رمضانی نے کہا ــــــ "بابو جی! جمہوریت کس کو کہتے ہیں"؟
میں نے کہا "بھائی میرے! جو چیز میں نے دیکھی نہیں اس کے متعلق کیا عرض کروں؟ سنا ہے کہ اگر بہت سے آدمی مل کر کہہ دیں کہ سورج مغرب سے نکلتا ہے اور مشرق میں غروب ہوتا ہے تو ان کی رائے کو جمہوری رائے کہنا پڑیگا۔ مثلاً انچاس آدمی کہیں کہ گدھے کے سر پر سینگ نہیں ہوتے اور اکیاون آدمی کہتے ہیں کہ گدھے کے سر پر سینگ ہوتے ہیں تو جمہوری فیصلہ یہی ہوگا کہ گدھے کے

سر پر سینگ ہوتے ہیں اور اگر اتفاق سے انچاس آدمی کوشش کر کے اکیاون آدمیوں میں سے دو آدمی توڑ کر لے جائیں اور پھر یہ گروہ کہے کہ گدھے کے سر پر سینگ نہیں ہوتے تو گدھے کے سر سے سینگ دیکھتے دیکھتے غائب ہو جائیں گے۔

خدا بخشے ہمارے علامہ اقبال بڑی سوجھ بوجھ رکھنے والے شاعر تھے۔ ان سے پوچھا گیا کہ جمہوریت کیا ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ —— جمہوریت ایک ایسا طرز حکومت ہے۔ جس میں کہ

بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

مطلب یہ ہے۔ کہ جمہوریت میں "دماغوں" کی گنتی نہیں ہوتی صرف ہاتھوں کی گنتی ہوتی ہے —— اور اس جمہوریت کا تماشا خود علامہ اقبال" نے بھی اپنی زندگی میں دیکھا۔ دنیا نے انہیں بہت بڑا مفکرؒ مانا۔ وہ شاعر مشرق۔ ترجمان حقیقت۔ پیغمبر خودی۔ حکیم الامت دانائے راز۔ علامہ۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ بار ایٹ لا۔ سبھی کچھ تھے مگر جب الیکشن میں کھڑے ہوئے تو ناکام ہوئے اور ان کی جگہ جس شخص کے سر پر کامیابی کا سہرا بندھا اس کو سوائے اس کی آل اولاد کے چڑیا کا بچہ بھی نہیں جانتا۔ مگر صاحب جمہوریت کا فیصلہ یہی تھا

جب لوگوں نے دیکھا کہ ایسی جمہوریت جس میں دماغ کی مرمت

"ہاتھ کر دیں" بالکل بے کار ہے تو وہ سوچنے لگے یعنی "دماغوں" نے محاذ بنا لیا۔ دوسری طرف ہاتھ اپنے کام میں لگے رہے۔ اس منزل سے "دماغوں" نے اپنے اپنے سانچے بنائے اور ان سانچوں میں جمہوریت کو ڈھالنا شروع کیا۔ وہ نعرے لگانے لگے کہ

"ہماری جمہوریت تاندلیانوالہ منڈی کا خالص گھی ہے ملاوٹ ثابت کرنے والے کو پانسو روپیہ انعام"

مزے کی بات یہ ہے کہ ہر "ملاوٹ" پر "خالص" کا لیبل لگا دیا گیا —— یہاں تک کہ "کھوپرے کے تیل" کو "خالص گھی" کہا گیا اگر کسی نے "کھوپرے کے تیل" میں تھوڑا بہت "خالص گھی" ملایا۔ تو تو لوگوں نے کہا یہ "ملاوٹ" ہے —— پہلے تو لوگ خالص گھی میں ملاوٹ کرتے ہیں۔ اب "ڈالڈا" میں بھی ملاوٹ ہونے لگی بس جمہوریت کی بات بھی کچھ ایسی ہی ہے۔

جس طرح ایک انسان کی شکل دوسرے انسان سے اور ایک گھڑی کا وقت دوسری گھڑی سے نہیں ملتا اسی طرح ایک ملک کی جمہوریت دوسری ملک کی جمہوریت سے نہیں ملتی ۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھے کہ جمہوریت پانی بن گئی — یہ پانی آپ نے لوٹے میں ڈالا تو یہ لوٹا بن گئی۔ گلاس میں بھر دیا تو اس نے گلاس کا روپ دھارا۔ صراحی میں ڈالا تو اس کی صراحی دار گردن بنی۔ اسے آپ موم کی ناک کہہ

لیجیے۔ بس جدھر کو موڑا اُدھر کو مڑگئی۔ پہلے یہ نیچے سے اوپر کو جاتی تھی یعنی "نیچے والے" اپنی رائے سے" اوپر والوں کو بناتے تھے مگر "جمہوری انقلاب" دیکھئے کہ یہ" اوپر" سے" نیچے" آنے لگی۔" اوپر والے" آئے اور "نیچے والوں" نے گھٹنے ٹیک کر انگوٹھے لگا دیئے۔ اس کو بھی جمہوریت ہی کا نام دیا گیا۔

جس طرح ایک شاعر کا محبت نے بری طرح حلیہ بگاڑا تھا اور اس نے کہا تھا ؎

محبت نے بری طرح مرا حلیہ بگاڑا ہے
کہ اپنی شکل بھی دیکھوں تو پہچانی نہیں جاتی

اس طرح جمہوریت کا کچھ ایسا حلیہ بگڑا ہے۔ کہ ہم آپ تو خیر پہچاننے سے رہے۔ اگر خود جمہوریت بھی آئینے میں اپنی طلعت مبارک کی زیارت کا شرف حاصل کرے تو خود کو نہ پہچان سکے۔

یہ تو خیر ایک عام جائزہ تھا دنیا بھر کی جمہوریت کا۔ ہم اپنے گھر میں آتے ہیں۔ ہمارے ہاں جمہوریت آئی۔

چنانچہ ایسا ہوا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوتا رہا۔ وہ آپ جانتے ہیں۔ عیاں راچہ بیاں۔ وہ جمہوریت جس کا نام مسلم لیگ تھا مرگئی۔ کیوں مرگئی —— یار لوگوں نے کرسیوں کی خاطر اس کا گلا گھونٹ

دیا۔ بکس توڑے —— پھر لو پھیرا —— دھاندلی کی —— تھانیدار کا ڈنڈا گھمایا ——

غرضیکہ اس کا خوب کچومر نکالا —— اُدھر یہ سب کچھ ہوا اور دوسری طرف "دماغوں" نے تعصب پھیلایا —— ان مظالم کو اجاگر کیا —— اور "ہاتھوں" نے ان کا ساتھ دیا وہ لوگ بھی جمہور کے نمائندے قرار پائے —— اِعلان ہوا کہ جمہوریت کی بحالی ہوگی۔ کرسی ملی تو "دماغ" کرسی پر چڑھ بیٹھا۔ جمہوریت بچاری تھکی ہاری تھی بستر پر لیٹ گئی اور پڑے پڑے سو گئی۔

اقبال کی خودی کی طرح جمہوریت سوئی ہوئی ہے —— اور یہ حکمران کی ساحری کا کمال ہے —— اب جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ جمہوریت کے نام پر ہو رہا ہے —— اور جمہوریت بچاری کو خبر ہی نہیں کہ اس کے پرستاروں نے اس کے لئے جوگی کا برن لیا ہے اور وہ جنگل جنگل گھوم رہے ہیں —— ایک شخص کو کرسی سے اتارا جاتا ہے۔ وہ کرسی سے اترتے ہی جمہوریت کی دہائی دیتا ہے کہ جمہوریت پامال ہو گئی۔ جو اس کو کرسی سے اتارتا ہے اس کو "شاباش" ملتی ہے کہ واہ واہ ؎

وہ کام کیا تو نے جو رستم سے نہ ہوگا

اگر وہی لوگ جو کرسی سے اترے بھتے حالات کے کروٹ

بدلنے پر پھر کرسی پر آ جائیں تو سمجھ لیجئے کہ جمہوریت پھر بحال ہوگئی ـــــ میں نے کہا ہاں تو ـــــ رمضانی بھائی! میں صرف یہ جانتا ہوں کہ جمہوریت کا دوسرا نام کرسی ہے۔ ملک فیروز خان نون کرسی پر تھے تو۔

- جمہوریت بحال تھی

وہ کرسی پر نہیں رہے تو:۔

- جمہوریت بے حال ہے۔

(۲۹۔ مئی ۱۹۵۸ء)

"انوکھے مشاعرے"!

اب تک تو یہ ہوا تھا کہ یار لوگوں نے انجمن بنائی اور اس کے اہتمام میں ایک مشاعرہ کر ڈالا ـــــ "آل پاکستان مشاعرے" سے لیکر مقامی مشاعرے تک اس قسم کے مشاعرے ہوتے رہے ـــــ ٹکٹ والے مشاعرے بھی اور بے ٹکٹ کے مشاعرے بھی ـــــ عام مشاعرے بھی اور محدود مشاعرے بھی ـــــ ادبی انجمنوں اور اداروں کے مشاعرے بھی ـــــ اور پرائیویٹ مشاعرے بھی ـــــ کالج کے مشاعرے بھی ـــــ اور کسی محکمے کے ملازمین کے مشاعرے بھی ـــــ وہ مشاعرے بھی جو ریڈیو پر نشر ہوتے ہیں اور

وہ بھی جو لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے گھر بیٹھے جاسوسی ناولوں کی طرح راتوں کی نیند حرام کرتے ہیں۔

یہاں تک تو خیر سب کچھ چل رہا تھا ——— مگر اب وہ بھی شروع ہو گئی ہے کہ جس طرح جیم کے پیٹ میں ایک نقطہ ہوتا ہے اسی طرح ہر دعوت کے پیٹ میں ایک مشاعرہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات دعوت نامے میں لکھدیا جاتا ہے کہ ——— "اپنے کلام بلاغت نظام سے سرفراز فرمائیے"! — یعنی جہاں کھانے کے لئے آپ دانت تیز کریں یا چورن کا انتظام کریں وہاں "ساؤنڈ" بکس کو بھی ٹھیک کریں اور نمکین پانی سے "غرغرے" بھی کریں۔ بیاض بھی جیب میں ڈال کر لائیں وغیرہ ——— خیر ان دعوت ناموں کی وجہ سے "شاعر لوگ" کو تیاری کا موقع مل جاتا ہے اور انہیں پتہ چل جاتا ہے کہ کھانے کے بعد گانا بھی ہو گا ——— "جس کا کھاؤ اس کا گاؤ" نہ سہی ——— مگر ——— جس کے ہاں کھاؤ اس کے ہاں گاؤ یعنی سہ

کھاؤ نمک تو حقِ نمک بھی ادا کرو

یہاں تک چلئے ——— اس کی اجازت دی جا سکتی ہے ——— کم از کم اس میں اتنی گنجائش تو ہے کہ جو لوگ اس کو پسند کرتے ہیں کہ کھانا کھا کر گانا شروع کریں وہ دعوت قبول کرلیں اور شوق سے جائیں۔ مگر جن کو یہ حرکت کچھ ناشائستہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ کھانا کھا کر مہمان

کھسکنے اور سرکنے کی سوچیں ـــــ اور ان سے کہا جائے کہ ـــــ "حضرات تھوڑی دیر اور زحمت گوارا فرمائیے کیونکہ "بڑا بڑا شاعر لوگ" موجود ہے اور وہ کلام سنائے گا"

ایسے لوگ دعوت نامے پڑھ کر دعوت میں شرکت میں معذوری کا اظہار کر سکتے ہیں۔

مگر اس سلسلہ میں ایک اور طریقہ بھی اختیار کیا جاتا ہے وہ یہ کہ عام دعوتوں کی طرح دعوتی کارڈ بھیج دیئے جاتے ہیں۔ جب کھانے کا قصہ ختم ہوتا ہے اور لوگ جانے کی سوچتے ہیں تو بغیر کسی پیشگی اطلاع کے شاعر سے کہا جاتا ہے۔

"حضرت! سب لوگ آپ کے ارشادات عالیہ سننے کے لئے بے تاب ہیں یعنی کہہ رہے ہیں ؎

آج غالب غزل سرا نہ ہوا

اور دوسری طرف مدعو حضرات سے کہا جاتا ہے کہ تھوڑی دیر اور تشریف رکھیئے۔

"حضرت پھیپھڑہ گردہ آبادی ـــــ آپ کو اپنا کلام سنائیں گے"!

یعنی حضرت پھیپھڑہ گردہ آبادی صاحب بغیر کسی اطلاع کے "بیگار" میں ـــــ "ایں ہمہ بچہ شتر است"! کہہ کر دھر لئے جاتے ہیں ـــــ انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ جب سب لوگ مہمان ہیں اور سب نے کھانا کھایا

ہے تو ایک شخص کیوں گائے ؟ ۔ سب کو گانا چاہیئے مگر شاعر ہونے کی سزا حضرت بھیپھڑہ گردہ آبادی کو ملتی ہے —— اگر ٹالتے ہیں تو نمک کی مار پڑتی ہے۔ بہرحال گلا صاف کرکے کچھ نہ کچھ سنانا ہی پڑتا ہے۔

بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک دعوت نامے کے ساتھ تین دعوت نامے اور بھی بھیجے جاتے ہیں کہ اپنے ہم ذوق دوستوں کو ساتھ لائیے شاعر صاحب ظاہر ہے کہ یہ دعوت نامے اپنے شاعر دوستوں کو دیتے ہیں اور اس طرح دعوت میں اچھا خاصا "مشاعرہ" جمع ہو جاتا ہے۔ اس طرح بھی شاعر لوگ اس جال میں پھنس جاتے ہیں، مگر بعض اوقات دعوت کے "داعی صاحبان" صاف طور پر دعوت نامے میں لکھ دیتے ہیں، یا زبانی کہہ دیتے ہیں —— کہ۔

"حضرت! دو چار شاعروں کو ساتھ لیتے آئیے گا"!

اس میں بھی "فرار" کی گنجائش باقی رہتی ہے یعنی بیگار میں پکڑے جانے کا خطرہ نہیں رہتا۔

یہ تو تھے وہ مشاعرے جو دعوتوں کے پیٹ میں جنم لیتے ہیں ——

اب اور سنیئے —— یار لوگوں نے خوشی کی تقریبات پر بھانڈوں اور طوائفوں کو بلانے کی بجائے شاعروں کو بلانے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ شاعر کی قیمت دو کوفتے ایک قورمے کی پلیٹ اور ایک

پلاؤ کی قاب ہے بس وہ سامنے رکھدیجئے اور غزل تو کیا پورا دیوان سماعت فرمالیجئے۔ شادی کے موقع پر ایسے مشاعرے ہوتے ہیں۔ غزلوں کے علاوہ ان میں شاعر لوگ سہرے بھی پڑھتے ہیں ؎

مالن بنا کے لائی کیا پُر بہار سہرا

شادی کے بعد خوشی کی ایک اور تقریب بھی آتی ہے خدا بیٹا بیٹی دیتا ہے۔ اگر بیٹی ہوئی تو خیر سلسلہ آگے نہیں بڑھتا اور اگر بیٹا ہوتا ہے۔ تو پھر عقیقے اور ختنہ کی تقریب پر ایک مشاعرہ ہوتا ہے۔ اس قسم کے مشاعرے کراچی میں ہو چکے ہیں۔ مگر سب کے سب غیر طرحی —— ایک خوش ذوق بزرگ نے طرحی مشاعرہ بھی کر ڈالا۔ اس "مختون" مشاعرے کا مصرع طرح تھا ؎

مسلمانی میں طاقت خون کے بہنے سے آتی ہے

یہ مصرع اکبر الہ آبادی کا ہے پورا شعر یوں ہے ؎

بوقت ختنہ میں رویا تو نائی نے کہا ہنسکر
مسلمانی میں طاقت خون کے بہنے سے آتی ہے

خیر یہاں تک بھی گوارا کر لیجئے۔ مگر خوشی کی تقریبات سے یہ سلسلہ بڑھ کر اب غم کی مجلسوں تک پہنچ گیا ہے۔ مثلاً ایک آدمی مرگیا۔ اس کے چالیسویں پر بجائے فاتحہ درود اور نذر ونیاز کے یار لوگ مشاعرہ کر رہے ہیں اور یہ سلسلہ صرف چالیسویں پر ہی ختم نہیں ہوتا بلکہ ہر برس "برسی" کے سلسلے میں مشاعرہ ہوتا ہے —— اس

سلسلے میں ابھی ترقی کی گنجائش ہے یعنی قل کی رسم کے موقع پر یہی یار لوگ بجائے فاتحہ درود کے مشاعرے کی رسم ایجاد کرنا چاہتے ہیں تاکہ مرنے والے کی رُوح کو غزلوں کا ثواب پہنچایا جائے۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ اگر مسلم لیگ زندہ نہ ہو تو اس کو دفن کرنے کے بعد یار لوگ بجائے فاتحہ درود کے ایک عدد مشاعرہ داغ دیں۔

یہاں تک تو انوکھے مشاعروں کا ذکر تھا۔ اب آخر میں کچھ شاعروں کے متعلق سُن لیجئے۔ مولانا الحاج ماہرالقادری صاحب راوی ہیں (عذاب بر گردن راوی) کہ ایک مشاعرے میں ایک شاعر صاحب تشریف لائے انھوں نے منتظمین سے اصرار کیا کہ انہیں فوراً پڑھوا دیا جائے۔

منتظم حضرات نے کہا۔ "حضور! آپ یکے از اساتذہ کرام ہیں اس لئے آپ کی باری بعد کو آئے گی"۔

شاعر نے کہا۔ "میں اتنی دیر نہیں رک سکتا فوراً غزل پڑھ کر گھر جانا چاہتا ہوں کیونکہ میرا بیٹا مر گیا ہے اور اُسکے کفن دفن کا بندوبست کرنا ہے۔"

آخر میں ایک اور شاعر کا دلچسپ قصہ بھی سُن لیجئے ایک شاعر کسی دوسرے شہر سے مشاعرے میں شرکت کے لئے آرہے تھے۔

اتفاق سے گاڑی کو حادثہ پیش آیا تو گاڑی لیٹ ہوگئی اور

بجائے رات کے نو بجے پہنچنے کے تین بجے شب پہنچی - اس وقت" مشاعرہ گاہ" میں شاعروں کی بجائے الو بول رہا تھا - چند مزدور دریاں تنبو قنات اور کرسیاں اٹھا رہے تھے شاعر صاحب مایوس ہو چلے تھے مگر انہیں ایک ترکیب سوجھی فوراً اسٹیج پر کھڑے ہو کر کہا -

" اے مزدورو ! میں بھی مزدور شاعر ہوں بڑی دور آیا ہوں گاڑی لیٹ پہنچی ہے تو اس میں میرا کیا قصور ؟ - لوگ جا چکے ہیں مجھے ان کی پروا نہیں تم لوگ تنبو قناتیں کرسیاں چھوڑ کر جہاں جہاں کھڑے ہو وہاں بیٹھ جاؤ - میں تمہیں ایک نظم سنانا چاہتا ہوں جس کا عنوان ہے :-

"مزدور کی موت" !

راوی کا بیان ہے یہ نظم جب ختم ہوئی ـــــ صبح کی اذان ہو رہی تھی اور مزدور گہری نیند کے مزے لوٹ رہے تھے -

(۲ - فروری ۱۹۵۵ء)

"سیاسی یتیم خانہ"!

خدا سیٹھ عبداللہ ہارون کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ جنھوں نے کراچی میں "یتیم خانہ حاجی عبداللہ ہارون" کی داغ بیل ڈالی جو اللہ کے فضل وکرم سے اب بھی چل رہا ہے۔ ہمیں توقع تھی کہ "بڑے سیٹھ" کے بعد "چھوٹے سیٹھ لوگ" بھی اپنے والد محترم کے نقشِ قدم پر چلیں گے خصوصاً ان حالات میں جبکہ کراچی کی آبادی پہلے سے چھ سات گنا بڑھ گئی ہے۔ نئے یتیم خانوں کی ضرورت تھی وہ اس کمی کو محسوس کرینگے۔ مگر ان کو سیاست کے رگڑوں جھگڑوں سے ہی فرصت نہیں ملتی کہ کسی تعمیری کام کی طرف توجہ دیں۔

اگر وہ یتیم خانہ نہیں بنا سکتے تو پھر ہماری ایک تجویز پر عمل کریں۔ جس میں "چھوٹے سیٹھ لوگ" کا بھی سیاسی فائدہ ہے۔ یہ تجویز رمضانی کی ہے۔ مجھے صرف اس کی پیش کش کا شرف حاصل ہے۔ تجویز یہ ہے کہ ایک بہت بڑا "سیاسی یتیم خانہ" بنایا جائے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ — "سیاسی یتیم خانہ" کیوں بنایا جائے تو جواباً گذارش یہ ہے کہ نو دس برس کی مدت میں ہمارے ہاں کتنے جوڑ توڑ۔ کتنی اکھاڑ پچھاڑ۔ اور کتنی تبدیلیاں ہوئی ہیں کتنی کرسیاں ٹوٹی ہیں۔ کتنی کرسیوں کی لڑائیاں ہوئی ہیں اور کتنی نئی مضبوط کرسیاں تیار ہوئی ہیں۔ ان تمام سرگرمیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک سینکڑوں "سیاسی یتیم" دربدر ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ ان میں ایسے یتیم بھی ہیں جو مرکزی وزیر رہے۔ ایسے یتیم بھی ہیں جو وزیر اعظم رہے۔ ایسے یتیم بھی جو گورنر جنرل رہے۔ ایسے بھی ہیں جو گورنر رہے۔ ایسے بھی ہیں جو صوبوں کے وزیر اعلیٰ رہے ایسے بھی ہیں جو صوبوں کے وزیر رہے، نائب وزیر رہے۔ مشیر رہے۔ اسمبلیوں کے ممبر رہے۔ میونسپل کمیٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے صدر رہے۔ ممبر رہے ایسے بھی ہیں جو سفیر رہے۔ غرضیکہ اگر "سیاسی یتیم شماری" ملک میں ہو تو ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچ سکتی ہے۔ ہر قدم پر ایک سابق وزیر ملتا ہے سابق سفیر ملتا ہے، سابق گورنر ملتا ہے اگر دس لونڈوں کو جمع کر کے لوگ یتیم خانہ بناتے ہیں تو پھر اتنی بڑی کھیپ سیاسی یتیموں کی جہاں موجود ہو وہاں "سیاسی یتیم خانہ" بنایا جائے۔

سچ پوچھئے تو یہ سارے جھگڑے انہیں سیاسی یتیموں کے کھڑے کئے ہوئے ہیں۔ یہ ساری خرابی ان سیاسی یتیموں کے "فری اسٹائل دنگل" کی لائی ہوئی ہے اگر "سیاسی یتیم خانہ" بن جائے تو یہ لوگ ایک جگہ جمع ہو جائیں۔ اور ملک میں انتشار نہ پھیلائیں۔ اگر "چھوٹے سیٹھ" یہ یتیم خانہ بنائیں تو واقعی ان کا یہ عظیم الشان کارنامہ ہوگا۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو حکومت کو خود ایسا یتیم خانہ بنانا چاہیئے۔ کیونکہ ہم نے یہی دیکھا ہے جو کرسیوں پر بیٹھتے ہیں وہ کرسیاں چھن جانے کے بعد "سیاسی یتیم" ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ بے کرسی والے یعنی سیاسی یتیم پھر کرسی پر آ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے یتیم خانے کا فائدہ آج نہیں تو کل اہل حکومت کو پہنچے گا کیونکہ۔ ہمیشہ ایک سا وقت تو نہیں کرسی نے کب کسی سے وفا کی ہے۔ اور ہمارے ملک میں تو اس کا مزاج معشوق کے مزاج سے بھی نازک ہے۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ!

یہ سوال تو حل ہو گیا۔ کہ "سیاسی یتیم خانہ" کیوں بنایا جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ سیاسی یتیم خانے میں کیا ہو؟ پہلے تو ان سیاسی یتیموں کو ایک جیسی وردیاں ایک جیسے لوٹے اور ایک جیسی ٹوپیاں دی جائیں تاکہ دیکھنے والے پہچان لیں کہ یہ "سیاسی یتیم ہیں"۔ صبح یہ لوگ ایک گھنٹہ سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کر کے دیوار کے سہارے کھڑے رہیں۔ ان سے ان کا دماغ سیاست میں خوب چلے گا۔ پھر نہا دھو کر یہ ناشتہ کریں۔ اور اخبار پڑھیں۔ اخبار پڑھنے کے بعد یہ خوب بحث کریں۔ بحث کرنے کے بعد بیان دیں۔ پھر ان کو یہ بھی سکھایا جائے۔ کہ

ایک بات کہہ کر اس کی کس طرح تردید کرنی چاہیئے۔ پھر ان کو یہ بھی سکھایا جائے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کس طرح لڑھک کر جانا چاہیئے"۔ یہ عملی سبق ہوگا جس میں "بے پیندے کے لوٹے" اور "بے تھالی کے بینگن" استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ بینگن اس لئے زیادہ مفید ہیں کہ بعد میں ان کی ترکاری بھی بن سکتی ہے سب سے بڑا دوس ان کو اس کا دینا چاہیئے کہ "اعتراض برائے اعتراض اور" اختلاف برائے اختلاف" کس طرح کیا جاتا ہے اسکے لئے تو بعض " سیاسی یتیموں" کو ٹریننگ کے لئے لندن بھیجا جائے۔ اس سے پہلے کرسی چھننے کے بعد ایسے" سیاسی یتیم لندن جاتے رہے مگر ذاتی طور پر کسی ادارے کے نظام کے تحت نہیں جس رفتار سے ہمارے ہاں " سیاسی یتیموں" کی تعداد بڑھ رہی ہے اسکے پیش نظر یہ یتیم خانہ بہت ترقی کریگا۔ یہاں سے" سیاسی یتیم" بھی حکومت بنائیں گے۔ پھر کرسیاں چھن جائیں گی تو وہ" سیاسی یتیم" کی حیثیت سے یتیم خانے میں آجائیں گے اور ان کی جگہ دوسرے" سیاسی یتیم" لیں گے۔ اب تک رمضانی نے لیڈروں کے بیان پڑھے ہیں۔ امید ہے کہ اب رمضانی کا یہ بیان لیڈر اور خصوصاً "سیاسی یتیم" ضرور پڑھینگے اور ؎ "دنیا کے سیاسی یتیمو متحد ہو جاؤ"
کا نعرہ لگا کر میدان عمل میں کود پڑیں گے۔ خصوصاً" چھوٹے سیٹھ لوگ" کو اس نیک کام میں ضرور حصّہ لینا چاہیئے۔

(۱۹؍ اپریل ۵۷ء)

"وقت کا چکّر"

رمضانی گھڑی اس لئے نہیں خریدتا کہ کون گھڑیاں اور پل گن گن کر وقت گذارے۔؟ وہ تو صرف یہ جانتا ہے ؎

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یونہی تمام ہوتی ہے

ویسے بھی وقت کے چکر میں کون پڑے۔ یوں تو ہر جگہ لیکن کراچی میں خاص طور پر بہت سے وقت چلتے ہیں۔ بعض گھڑیاں صبح پونے سات بجے کارپوریشن کے "بھونپو" سے ملائی جاتی ہیں لیکن اس وقت کارپوریشن

کے گھنٹہ گھر میں سات بجنے میں دس منٹ ہوتے ہیں - یہ" کارپوریشن ٹائم" ہے- دوسرا مشہور ٹائم" ہے" ریڈیو ٹائم" بڑے لوگ" عموماً" ریڈیو ٹائم" رکھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں یہ ٹائم بالکل درست ہے۔ کیماڑی میں" بحری ٹائم" چلتا ہے۔ یہاں جہازوں کے" وہسل" سے گھڑیاں ملائی جاتی ہیں- اور لیاری کوارٹرز" میں" ہوٹل ٹائم" چلتا ہے۔ یہ مزدوروں کا وقت ہے- اس وقت میں اور" ہارون چیمبر ٹائم" میں پندرہ منٹ کا فرق ہوتا ہے- یعنی جس وقت" سیٹھ لوگ" کی گھڑی میں پونے دس بجتے ہیں اس وقت" لیاری کوارٹرز" کی گھڑیاں دس بجاتی ہیں۔ یہ فرق اس لئے ہے کہ مزدور اپنے کام پر پندرہ منٹ پہلے آئیں۔" کلرک ٹائم" بھی یہی ہے- اسکے مطابق دفتر میں سب سے پہلے کلرک ہی آتے ہیں- لیکن افسروں کی گھڑیاں آزاد ہیں- وہ جس وقت چاہیں جو کچھ بجاویں" انہیں" مکمل آزادی" ہے۔ بعض افسروں کی گھڑیوں میں اس وقت نو بجتے ہیں۔ جب" کلرک ٹائم" دس ہوتا ہے۔ اس حساب سے بعض بڑے افسر گیارہ بجے دفتر آتے ہیں۔

باقی رہا" کراچی ٹائم" تو اس کی کیا پوچھتے ہیں۔ یہاں" سب چلتا ہے" گدھا گاڑی چلتی ہے۔ رکشا چلتا ہے۔ اونٹ گاڑی چلتی ہے۔"کھوپرا مل" چلتا ہے۔ قسم قسم کا بس چلتا ہے۔ پان میں چونا جاستی چلتا ہے۔ دودھ میں پانی چلتا ہے۔ خالص گھی میں مونگ پھلی کا تیل چلتا ہے۔ سینما میں "گھڑی توڑ" ہفتہ چلتا ہے۔ سب وقت کی بات ہے۔ اور آپ

جانتے ہیں کہ وقت کبھی چلتا ہے ۔ وقت اگر رک جائے تو وقت نہیں ہے فرق صرف اتنا ہے کہ ہم آپ وقت کے پابند ہیں اور " بڑے لوگ " کا وقت پابند ہے ۔ اسلئے تو کہتے ہیں کہ صاحب " یہ وقت کے حاکم ہیں " ۔! " بادشاہ " !

اِدھر " پیغمبری وقت " ہے ۔ جیب میں خدا کا نام ہے ۔ رہے نام اللہ کا! اور اُدھر سے

نیند ان کی ہے دماغ ان کا ہے راتیں انکی ہیں

جلسوں کے اشتہار بعض " دیندار " ہوتے ہیں ۔ بعض " بے دین " ۔ دیندار اشتہار " وہ ہوتے ہیں جن میں لکھا ہوتا ہے ۔ کہ آرام باغ میں عظیم الشان جلسہ بعد نماز عشاء ہو گا ۔ اس لئے " دیندار لوگ " عین وقت پر پہنچ جاتے ہیں ۔ کیونکہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ عشاء کی نماز کا کیا وقت ہے ۔ لیکن وہ لوگ جنہوں نے کبھی عید بقر عید کے علاوہ نہ مسجد کی صورت دیکھی ہو نہ نماز پڑھی ہو عموماً پوچھتے ہیں

" کیوں جی ۔ ! آجکل عشاء کی نماز کس وقت ہوتی ہے ؟ "

" یعنی ان کا خیال ہے کہ ریلوے ٹائم ٹیبل کی طرح نماز کا وقت بھی بدلتا ہے " بے دین اشتہار " وہ ہوتے ہیں جن میں لکھا ہوتا ہے جلسہ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے شروع ہو گا ۔ ظاہر ہے کہ یہ " ٹھیک ساڑھے آٹھ " " انگلش ٹائم " ہے ۔ لیکن اب انگریز جا چکا ہے ۔ اسلئے " ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے والا جلسہ عموماً ساڑھے دس بجے شروع ہوتا ہے ۔ گویا آزادی کے

بعد دو گھنٹے کا فرق اب ہمارا "پیدائشی حق" ہے۔

میں سوچتا ہوں کہ جس طرح انسانوں میں ایک کی شکل دوسرے سے نہیں ملتی اور ہم پہچان لیتے ہیں کہ مولوی گلشیر خان ہے اور وہ بندو یہ رمضانی ہے اور وہ سائیں سلیمان بادشاہ اسی طرح ایک گھڑی کا وقت دوسری گھڑی سے نہیں ملتا۔ کیونکہ ان گھڑیوں میں ٹائم الگ الگ ہوتے ہیں۔ رمضانی کہتا ہے کہ صرف دو گھڑیاں ایسی ہیں کہ جن میں ایک منٹ کا بھی فرق نہیں ہوتا۔ ان میں ایک تو وہ ہے جو وہ اپنے بیٹے شبراتی کے لئے تین آنہ میں عید کے دن لایا تھا اور دوسری "لکشمی بلڈنگ" کی گھڑی ہے!

شبراتی کی تین آنے والی گھڑی میں عید کے دن سے ابتک سوا دو بجے ہیں اور "لکشمی بلڈنگ" کے "گھنٹہ گھر" کا وقت وہی ہے جو آج سے آٹھ برس پہلے پندرہ اگست کو تھا۔

کہتے ہیں کہ یہ وقت کے آگے چلنا چاہتا ہے لیکن "لکشمی دیوی" کا وہ بت جو اس بلڈنگ پر نصب ہے وقت کو آگے نہیں بڑھنے دیتا۔ اسکے چار ہاتھ ہیں۔ اور کوئی ہاتھ ان ہاتھوں کو روک نہیں سکتا۔

(۱۰۔ مارچ ۵۷ء)

"میں سوچتا ہوں"

میں سوچتا ہوں کہ - یہ بڑی بڑی کوٹھیاں، یہ آسمان سے باتیں کرنے والے رنگ محل اپنی وسعتوں کے باوجود تنگ دل اور کتنے تنگ ظرف ہیں جو بارش کے دنوں میں بھی کسی کو پناہ نہیں دے سکتے. یہ طوائفیں ہیں، وہ طوائفیں جن کی قیمت تجوری میں جنم لیتی ہے- اور نیکوں میں دم توڑتی ہے اور یہ " فٹ پاتھریاں" فٹ پاتھ سے کتنی فراخ دل ہیں - ان کے سینے طویل وعریض ہیں - ان کی باہیں پھیلی ہوئی ہیں رات کو پاک مملکت کے ہزاروں بیٹے ان کی آغوش میں سوتے ہیں -

یہ مائیں ہیں غریب بچوں کی مائیں۔ سٹیشن سے سامان اٹھانے والوں کی مائیں۔ بوٹ پالش کرنے والوں کی مائیں ۔ یہ انسان کتنے احسان فراموش ہیں جو دن بھر ان کے سینے کو روندتے ہیں ۔ یہ انسان کتنے سفاک ہیں جو ان پر پیشاب کرتے ہیں یہ پاک سرزمین کو ناپاک کرتے ہیں یہ بد باطن ہیں ! یہ ملعون ہیں ۔ یہ بے ہودہ ہیں !

اور ــ یہ بڑی بڑی بلڈنگیں یہ طوائفیں کتنی ظالم ہیں جو دن بھر ان پر غلاظت پھینکتی ہیں ۔ گندہ پانی، پان کی پیک، راکھ ۔ کوئلے ۔ باسی چاول ۔ سڑی ہوئی دال ۔ روٹی کے متعفن اور بدبودار ٹکڑے !

مفلسوں کی یہ مائیں "یہ فٹ پاتھیاں" کتنا جبر سہہ رہی ہیں ان ماؤں کے ہزاروں بیٹے بھوکے سو رہتے تھے لیکن یہ انہیں کچھ نہیں دیتیں ۔ ان کے پاس کیا ہے ؟ ان بڑی بڑی بلڈنگوں یعنی طوائفوں کے پھینکے ہوئے چاول سڑی ہوئی دال، غلیظ ٹکڑے ایک یہ ہیں کہ جنہیں نپا تلا غلہ ملتا ہے ۔ اور ایک یہ طوائفیں ہیں یہ بڑی بڑی بلڈنگیں جو پیٹ بھر کر کماتی ہیں اور بچا کھچا پھینک دیتی ہیں ۔

میں یہ سوچتا ہوں کہ ـــــ "پگڑی" کی لعنت ختم نہیں ہوگی جو ہاتھ "پگڑی" کی طرف بڑھتا ہے ۔ اس میں نوٹ تھمائے جاتے ہیں ۔ وہ بجائے بڑھنے کے پلٹ جاتا ہے ۔ پگڑی کے پھندے سے تو ہم رہائی نہیں پا سکتے کیوں نہ پگڑی پر کنٹرول کر دیا جائے ۔ ایک "فلیٹ" کی کنٹرول ریٹ پگڑی پانچ سو روپے سے لے کر ڈیڑھ ہزار تک ۔ لیکن اس کنٹرول کے بعد "بلیک مارکٹ شروع

ہو گی۔ پانچ سو روپے " کنٹرول ریٹ پگڑی " کا فلیٹ تین ہزار روپے ملے گا اس بلیک مارکٹ کو روکنے کے لئے جو ہاتھ بڑھے گا رشوت اسے روک لے گی۔

اور میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ رشوت کیسے رُکے۔ رشوت تو رکتی نظر نہیں آتی یہ اتنی ہی اُبھرتی ہے جتنا ہم اسے دباتے ہیں یہ ربڑ کی گیند ہے ہم اسے زور سے پھینکتے ہیں یہ زمین سے ٹکرا کر پھر ہماری طرف اسی زور سے آتی ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ چھوٹی تنخواہ لینے والے زیادہ رشوت لیں اور بڑی تنخواہ لینے والے کم —! تنخواہوں کے مطابق " رشوت اسکیل " بنایا جائے چھوٹی تنخواہ والے اسلئے رشوت لیتے ہیں کہ کم تنخواہ میں ان کا گذارہ نہیں ہوتا لیکن بڑی تنخواہوں والوں کے اخراجات بڑے ہیں ان کا بھی تو گذارہ نہیں ہوتا۔ چپراسی چائے پانی چاہتا ہے "۔ صاحب " کو وہسکی بوتل " چاہیئے قوم تباہ ہو، ملک غارت ہو، ان کا گذارہ ہونا چاہیئے کوئی حکومت اسے ختم نہیں کر سکتی اسکو صرف خدا کا غضب ختم کر سکتا ہے اور خدا کا غضب اُسے ختم کرے گا۔

میں بہت کچھ سوچتا ہوں لیکن افسوس کہ جو کچھ سوچتا ہوں لکھتا نہیں ابھی ابھی میں رکشہ پر آرہا تھا پاس سے گدھا گاڑی گذری اور دیکھتے ہی دیکھتے رکشہ سے آگے نکل گئی۔ یقیناً یہ گدھا پٹرول پیتا ہے میں سوچتا ہوں کہ اگر رکشہ میں گدھے کو استعمال کیا جائے تو کم از کم یہ ظلم تو ختم ہو جائے تو انسان پر ہوتا ہے لیکن کتنے لوگ اس رکشہ پر بیٹھنا گوارہ کرینگے

جسے گدھا چلائے گا؟ اگر آپ اس قسم کے رکشہ پر بیٹھنا ذلت سمجھتے ہیں۔ تو یہ کس طرح گوارا کرتے ہیں کہ اس رکشہ پر بیٹھیں جسے آپ کی طرح ایک انسان چلاتا ہے آپ بھی اشرف المخلوقات ہیں اور وہ بھی —— ! کاش کبھی آپ یہ بھی سوچتے اور آپکے سوچنے سے مظلوم انسانوں کو اس عذاب سے نجات ملتی !

رات ایک مجلس میں کوئی صاحب نظم پڑھ رہے تھے۔ نظم میں عربی اور فارسی کے کتنے مشکل الفاظ تھے کہ ان کو یا تو کوئی منشی فاضل سمجھ سکتا تھا یا کوئی مولوی فاضل یا وہ جو ہر وقت ڈکشنری پاس رکھے ابھی دو بند بھی ختم نہیں ہوئے تھے کہ لوگ سرکنا شروع ہو گئے اور دیکھتے دیکھتے حاضرین کی تعداد ساڑھے پندرہ تک پہنچ گئی اور ان میں سے بھی بعض لوگ اٹھ رہے تھے۔ بعض اٹھنے کا ارادہ کر رہے تھے۔

میں سوچتا ہوں کہ اس قسم کے لوگوں کی خدمات حکومت کو حاصل کرنا چاہیئے تاکہ اگر کسی خلاف قانون مجمع کو منتشر کرنا مقصود ہو تو ان سے لاٹھی چارج اور "آنسو لانے والی گیس" کا کام لیا جائے۔ ادھر انھوں نے نظم شروع کی اور ادھر لوگ منتشر ہو گئے۔ سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹی —

"دلدار ہوٹل" میں —— جو یہ صاحب رہتے ہیں غالباً کسی دفتر میں ہیڈ کلرک ہیں۔ ڈیڑھ سو روپیہ تنخواہ پاتے ہیں اس کمرے کا کرایہ پانچ روپے روز ہے۔ تنخواہ تو کرائے میں اُٹھ جاتی ہے لیکن ہوٹل کا مینجر

کہتا ہے کہ یہ کرائے کے علاوہ کھانے کا بل بھی ادا کرتے ہیں جو دو سو روپے سے کچھ اوپر ہوتا ہے۔ انہیں مکان ابھی تک نہیں مل سکا اس لئے بال بچے ان کے وطن میں ہیں ان کو بھی یہ تین سو روپیہ مہینہ بھیجتے ہیں اور پھر شام کو بھی ذرا ..... میں سوچتا ہوں کہ ہمارے روپے کی قیمت یقیناً زیادہ ہے یعنی ڈیڑھ سو روپے کی قیمت تقریباً ڈیڑھ ہزار روپے!

(۲۳ر فروری ۱۹۵۷ء)

کنہیا لال کپور

نئے اردو ادب نے کنہیا لال کپور سے تیکھا طنز نگار پیدا نہیں کیا۔ کپور کا طنز مردہ دلوں کو چھید ڈالتا ہے اور جامد ذہنوں کو تہ و بالا کر دیتا ہے۔ کپور کا طنز ایک نئے دل و دماغ کی داغ بیل ڈالتا ہے ایسا دل و دماغ جو ماضی کی فرسودگی پر آسودہ نہ ہو اور مستقبل کو ہنستے ہنستے اپنے قریب کر لے۔

سنگ و خشت ۲/۵۰ مجلد ۶/= گرد کارواں ۲/۵۰ مجلد ۶/=

نرم گرم ۲/۵۰ مجلد ۶/= چنگ و رباب ۲/۵۰ مجلد ۶/=

بال و پر ۲/۵۰ مجلد ۶/= دلیل سحر ۲/= مجلد ۴/=

تل پھل (پنجابی) ۱/۷۵ مجلد ۴/۰۰

نوک نشتر ۲/۵۰ مجلد ۶/۰۰

مکتبہ میری لائبریری لاہور ۲

شفیق الرحمٰن

شفیق الرحمٰن موجودہ دور میں صحت مند ادب کا بانی ہے

ماہنامہ "ادبِ لطیف"۔

شفیق الرحمٰن کے افسانے پڑھ کر شوخ رنگوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے سرخ اسرخ، نارنجی، یاقوتی، زعفرانی، کرشن چندر

سارے نئے ادب میں بس لے دے کے ایک شفیق الرحمٰن صاحب ہیں جنہوں نے تفریحی ادب کی طرف توجہ دی ہے

محمد حسن عسکری، ہنستے مسکراتے مجموعے:

مزید حماقتیں۔ مجلد ۱۰/۰۰ میری لائبریری ۵/۵۰

لہریں۔ مجلد ۶/۰۰ حماقتیں۔ مجلد ۱۰/۰۰، میری لائبریری ۵/۵۰

پرواز۔ مجلد ۶/۰۰ میری لائبریری ۳/۰۰

مکتبہ میری لائبریری لاہور

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No
★ MAILSI ★

کتابخانہ / محمد ہارون موسیٰ

04 FEB 2021



کنھیا لال کپور: اُردو ادب میں یہ نام زبان پر آتے ہی دل و دماغ میں مسرت اور شرارت کے چشمے سے پھوٹ نکلتے ہیں۔ کپور کی گدگداتی اور چٹکیاں لیتی ہوئی باتیں بے اختیار یاد آنے لگتی ہیں اور بے رس اور سپاٹ زندگی میں معنی سے پیدا ہونے لگتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کے اُجڑے ہوئے منظر میں پانی، ہوا، بادل، روشنی، خوشبو — در آئے ہیں — جینے کو جی چاہنے لگتا ہے۔

میری لائبریری میں کپور کا مکمل سیٹ

طبع ہو چکا ہے۔

		مجلد			مجلد
سنگ و خشت	2.00	6.00	گرد کارواں	2.50	7.00
شیشہ و تیشہ	2.00	6.00	نرم گرم	2.50	7.00
چنگ و رباب	2.00	6.00	دلیل سحر	2.00	4.00
بال و پر	2.50	7.00	تل پھل (پنجابی)	2.00	4.00
نوک نشتر	2.00	6.00	کپور کے بہترین مضامین (زیر طبع)		

مکتبۂ میری لائبریری، لاہور